داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت500 روپے

حصہ دوم سُورۃ آل عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات326، قیمت500 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات331، قیمت500روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات394، قیمت550روپے

حصہ پنجم سُورۃ مَریَم تا سُورۃ السَّجدۃ
صفحات480، قیمت750روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
صفحات484، قیمت750روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس
صفحات560، قیمت800روپے

(مکمل سیٹ:4300روپے)

مکتبہ خُدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

جُمادی الاُولیٰ ۱۴۴۲ء

جنوری ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اِسلام پر دجّالیت کا تازہ حملہ

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 70

شمارہ : 1

جُمادی الاُولیٰ 1442ھ

جنوری 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

اسرائیل کو کیوں تسلیم نہیں کیا جانا چاہیے؟ — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن 9

سورۂ قٓ (مکمل) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ وتبصرہ 33

اسلام پر دجّالیت کا تازہ حملہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

شہیدِ مظلوم 65

جنّت الفردوس کا عظیم مہمان: عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ — پروفیسر عبدالعظیم جانباز

گوہرِ دریائے قرآن 77

چند مشہور عربی تفاسیر اور اُن کی خصوصیات — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

جوہر تلاشی 85

''اصلاحِ تحریر کمیٹی'' کا قیام — حافظ عاکف سعید

خودنوشت 87

سرگزشتِ حیات — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسرائیل کو کیوں تسلیم نہیں کیا جانا چاہیے؟

متحدہ عرب امارات اور بحرین کے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کی خبر آنے کی دیر تھی کہ ہمارے ہاں کے ایک خاص طبقے نے بھی فوری طور پر اُچھل کود شروع کر دی کہ پاکستان کو بھی اب اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہمارے نادان دوست یہ ''دانشورانہ'' دلیل دیتے ہیں کہ جن عربوں کا مسئلہ اسرائیل سے ہے وہ اگر اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم پاکستانیوں کو کیا تکلیف ہے کہ ہم اسرائیل سے کٹی رکھیں اور ہمسایوں کے معاملات میں چوتھے محلے سے دخل اندازی کریں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی اس بودی دلیل کو بڑی ناقابلِ تسخیر دلیل سمجھتے ہیں۔ لاکھوں میں معاوضہ پانے والے ایک اینکر قوم کو اس کے مالی فوائد کی تفصیل سمجھا رہے تھے اور نہ تسلیم کرنے کے نقصانات بڑے خوفناک بتا کر اپنے ناظرین کو ڈرا رہے تھے۔ ایک ٹی وی اینکر کو اسرائیل کے ٹی وی چینل i24 نیوز کو انٹرویو دینے کا ''اعزاز'' حاصل ہوا ہے۔ بہرحال اِس باسی کڑاہی میں پھر اُبال آیا ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حق میں بولنے والوں کی تعداد اگرچہ آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن اُن کی چیخ و پکار اور اُن کے شور شرابے نے آسمان سر پر اُٹھایا ہوا ہے۔ ہماری رائے میں پاکستان کو کیوں اسرائیل کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے؟ اِسے سیاسی اور مذہبی زاویے سے الگ الگ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح بانیٔ پاکستان اور بابائے قوم تھے اور پاکستان کے واحد سیاست دان تھے جو غیر متنازعہ تھے۔ اُنہوں نے اسرائیل کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"Israel is an illegitimate child of the West."

یعنی اسرائیل مغرب کا ناجائز بچہ ہے۔ اسرائیل کے قیام سے کئی سال پہلے اُنھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جب تک ایک بھی مسلمان مرد اور عورت زندہ ہے' اسرائیل کے وجود کا کوئی جواز قابلِ قبول نہیں۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان جو قائداعظم کے دستِ راست تھے' وہ بحیثیت وزیراعظم پہلے سرکاری دورہ پر امریکہ گئے۔ وہاں یہودیوں نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اُن کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ اُس میں میزبان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر پاکستان اسرائیل سے تعلقات پیدا کر لے تو پاکستان کو ناقابلِ یقین مالی فوائد پہنچائے جائیں گے۔ یعنی پاکستان دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرے گا۔ لیاقت علی خان نے اپنی جوابی تقریر میں کہا: "Gentlemen! Our souls are not for sale." یہ ٹکا سا جواب تھا' یہ مُسکت یعنی مُنہ توڑ جواب تھا۔ لہٰذا یہودیوں کا طویل عرصہ تک مُنہ بند رہا۔ ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے مشرقِ وسطیٰ کی جنگ جیتی تو اس کا جشن پیرس میں منایا گیا۔ وہاں سابق اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ عرب ہرگز ہمارے مقابل نہیں آسکتے' اِن کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمارا اصل دشمن اور حریف پاکستان ہے' جس سے ہمیں نمٹنے کے لیے تیاری کرنا ہوگی۔ اُنھوں نے کہا کہ پاکستان ہمارا نظریاتی حریف ہے۔ ہم دونوں نظریاتی ممالک ہیں (اگرچہ ہماری رائے میں اسرائیل نظریاتی نہیں' نسلی ملک ہے)۔ یاد رہے اُس وقت پاکستان ابھی ایٹمی قوت بھی نہیں بنا تھا' لیکن یہودیوں کی تیز نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اُن سے ٹکرانے کی کون صلاحیت رکھتا ہے؟ جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ عرب اسرائیل جنگ میں پاکستان کی فضائیہ میدان میں اُتری تھی اور اللہ کے فضل و کرم سے پاکستانی فضائیہ نے سو فی صد نتیجہ دیا تھا۔ یعنی جتنے اسرائیلی جنگی طیاروں کا پاکستان سے مقابلہ ہوا' اُن سب کو مار گرایا تھا۔ پھر کیا اہلِ پاکستان بھول گئے ہیں کہ اسرائیل نے بھارت کی مدد سے کہوٹہ پر حملہ کرنے کی متعدد بار کوشش کی تھی؟ اِس کا اعتراف پاکستان کے سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری عوامی سطح پر کر چکے ہیں۔

اگر آج ہم اسرائیل کو تسلیم کرنے کی ہمالائی غلطی کریں گے تو وہ ہمارے ہاتھ پاؤں بھی اُسی طرح باندھ دے گا جس طرح وہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک کے باندھ رہا ہے۔ اب اگر کوئی بات سمجھنا چاہے تو انتہائی واضح ہے۔ وہ یوں کہ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ اسرائیل کی اصل منزل گریٹر اسرائیل کا قیام ہے اور یہ بات اُس نے اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر کندہ کی ہوئی ہے: ''اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک''..... بلکہ وہ تو مدینہ منورہ کو بھی اِس میں شامل کرتا ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حق میں ہونے والوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر اسرائیل کو پاکستان تسلیم کر لیتا ہے تو وہ اپنے اِس اصل ہدف سے جو اُس کے بڑوں نے انیسویں صدی میں

طے کیا تھا' پسپائی اختیار کرلے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس کی پالیسی یہ دکھائی دے رہی ہے کہ جوگُڑ سے مرے اُسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ گریٹر اسرائیل اصل ہدف ہے جو بہرصورت حاصل کیا جائے گا۔

اب آجایئے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے اسرائیل کو تسلیم کرلینے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اللہ تعالیٰ کی آخری اور حتمی کتاب قرآن پاک آغاز ہی میں یہودیوں کو مغضوب علیہم اور گمراہ قرار دیتی ہے۔ ہر مسلمان اپنی نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے' اِس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کا یہودیوں کے بارے میں یہ فتویٰ بار بار دہراتا ہے۔ یقیناً ایک وقت تھا جب یہودی ایک مسلمان قوم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اِس قوم پر بڑی عنایات کیں۔ اللہ ربّ العزت نے موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا کیے تھے' اُس کے تمام تر فوائد تو بنی اسرائیل کو پہنچے۔ اُنھیں فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔ دریا میں پانی کو دیواروں کی صورت کھڑا کر کے اللہ نے اُن کے لیے راستہ بنایا۔ اُن کے لیے منّ وسلویٰ اُترا۔ عصا کی ضرب سے اُن کے ہر قبیلے کے لیے پہاڑ سے چشمے جاری ہوگئے۔ اُنھیں دھوپ کی شدّت سے بچانے کی خاطر بادل اُن کے سروں پر چلتے رہے' لیکن وہ ہمیشہ بدعہد قوم ثابت ہوئی۔ کبھی بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیتی اور کبھی نت نئے مطالبات کرتی' جو اکثر پورے کر دیے جاتے۔ لیکن اُنھوں نے وقت آنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر جہاد کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اُنھوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔ لہٰذا وہ بحیثیت اُمّت معزول کر دیے گئے۔ جتنا اُن کا اعزاز واکرام کیا گیا تھا' اُتنی ہی بلندی سے وہ نیچے پھینکے گئے۔ پھر جب نبی آخرالزماں خاتم النّبیین والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ کی مخالفت جتنی شدّت سے یہودیوں نے کی' اُتنی اہلِ کتاب میں سے کسی اور نے نہ کی۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی سورۃ المائدہ میں اللہ فرماتا ہے:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۸۲﴾

''(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) تم لازماً پاؤ گے اہلِ ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود کو اور ان کو جو مشرک ہیں۔ اور تم لازماً پاؤ گے دوستی کے لحاظ سے اہلِ

ایمان سے قریب تر ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی موجود ہیں اور مشائخ بھی' اور اس لیے بھی کہ وہ تکبّر نہیں کرتے۔''

مسلمانوں نے یہودیوں کو بدعہدی کی بنیاد پر پہلے مدینہ اور اُس کے نواح واطراف سے نکالا اور بعد ازاں خیبر سے اُنھیں نکالا گیا۔ عیسائیوں نے جب بیت المقدس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے مسلمانوں کے حوالے کیا تو یہ شرط رکھنا چاہی کہ وہ کبھی یہودیوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ دیں گے' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِس شرط کو تھوڑا سا نرم کر کے قبول کرلیا کہ یہودی یروشلم کو وِزِٹ تو کرلیا کریں' لیکن وہ کبھی یہاں آباد نہیں ہوں گے۔

مسلمانانِ پاکستان کو یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ تین مقدس ترین مقامات صرف وقت کے مسلمانوں کے لیے ہیں: مکّہ' مدینہ اور بیت المقدس۔ یہاں اللہ کے کسی دشمن کا قبضہ مسلمان کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ تاریخ میں بیت المقدس پر جب بھی غیروں کا قبضہ ہوا مسلمان اِس قبضہ کو چھڑانے کی کوشش کرتے رہے۔ اب اگر پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرتا ہے تو ظاہر ہے بیت المقدس پر اُس کے قبضہ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دجّال اسرائیل کو اپنا ہیڈ کوارٹر یا مرکز بنائے گا۔ وہاں ہی سے وہ لوگوں کو جنت اور دوزخ دے رہا ہوگا یعنی اپنے ماننے والوں پر نوازشیں کر رہا ہوگا اور حقیقی مسلمانوں پر بدترین ظلم وستم ڈھا رہا ہوگا۔ آخری زمانے میں جو جنگیں ہوں گی اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جہنّم واصل ہوگا۔ تب وہ لُد سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اسرائیل نے ایک ایئرپورٹ بنا دیا ہوا ہے۔ کیا ہم اُسے تسلیم کرلیں جس سے تاقیامت ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں سے جنگ طے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اِس قسم کے سوالات اُٹھا رہے ہیں اُن کی سوچ مادہ پرستانہ تو ہے ہی انتہائی سطحی اور احمقانہ بھی ہے۔ جو اپنے آج کے لیے دنیا میں بھی اپنے مستقبل کو تباہ کرلیتے ہیں اور آخرت کی شاید اُن کو کوئی پرواہ نہیں۔ گویا چند ٹکوں کی خاطر دُنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ ❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ قٓ

تمہیدی کلمات

سورۂ قٓ سے مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں (آخری) منزل کا آغاز ایک ساتھ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقام بھی گویا قِران السَّعدین ہے۔ قبل ازیں سورۂ یونس کے آغاز کو بھی میں نے اس لحاظ سے قِران السَّعدین قرار دیا تھا کہ وہاں پر بھی مکّی مدنی سورتوں کے نئے گروپ اور نئی منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں تو سورتوں کے گروپ اور منزل کے اعداد بھی برابر ہیں۔ یعنی سورۂ یونس کے آغاز کے ساتھ مکّی مدنی سورتوں کا تیسرا گروپ اور تیسری منزل ایک ساتھ شروع ہوتے ہیں‘ جبکہ یہاں پر مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر منازل (احزاب) کی تقسیم کے بارے میں بھی چند اہم نکات نوٹ کر لیجیے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ تقسیم ہفتے کے سات دنوں کے حساب سے کی گئی ہے تاکہ اگر کوئی شخص ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرنا چاہے تو وہ ہر روز ایک منزل (حزب) تلاوت کر لے‘ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر حضرات نے رات کے نوافل میں تلاوت کا یہی معمول اپنا رکھا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام منازل میں قرآن کی مقدار بالکل برابر نہیں بلکہ تقریباً برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منازل خالصتاً سورتوں کے حساب سے بنائی گئی ہیں اور مقدار برابر کرنے کے لیے پاروں کی تقسیم کی طرح سورتوں کو تقسیم نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے تیسری اہم بات یہ ہے کہ منازل کی تقسیم میں سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک خاص ’’حسنِ ترتیب‘‘ پایا جاتا ہے۔ یعنی پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں (اس گنتی میں سورۃ الفاتحہ شامل نہیں کہ وہ قرآن حکیم کے لیے بمنزلہ مقدمہ کے ہے اور سورۃ الحجر کی آیت ۸۹ کی رو سے خود ایک قرآن

ہے)‘ دوسری منزل میں پانچ سورتیں‘ تیسری منزل میں سات‘ چوتھی میں نو‘ پانچویں میں گیارہ‘ چھٹی میں تیرہ‘ جب کہ ساتویں منزل میں پینسٹھ سورتیں شامل ہیں (۶۵ کا عدد ۱۳ کا حاصل ضرب ہے)۔ گویا منزل بہ منزل سورتوں کی تعداد میں ایک خاص ’’عددی نسبت‘‘ کارفرما ہے جس کی وجہ سے اعداد کی ایک خوبصورت سیڑھی بنتی نظر آتی ہے۔ اور چوتھا اہم نکتہ یہ کہ ساتویں یا آخری منزل میں چونکہ سورتوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس منزل کو ’’حزبِ مفصّل‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔

مکّی مدنی سورتوں کا چھٹا گروپ جس کا آغاز سورۂ قٓ سے ہو رہا ہے‘ سات مکّی (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور دس مدنی (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکّی اور مدنی قرآن کا حجم تقریباً برابر ہے۔ یعنی سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک مکّی قرآن کا حجم تقریباً ایک پارے کے برابر ہے‘ جبکہ سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک مدنی قرآن تقریباً سوا پارے کے برابر ہے‘ اس کے بعد مکّی مدنی سورتوں کا ساتواں اور آخری گروپ زیادہ تر مکّی قرآن پر مشتمل ہے۔ مکّی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے سورتوں کے پہلے دو گروپس اور آخری دو گروپس میں باہم ایک بہت خوبصورت ’’مناسبت‘‘ پائی جاتی ہے۔ اس مناسبت کو یوں سمجھیں کہ جس طرح پہلا گروپ تقریباً تمام تر مدنی قرآن پر مشتمل ہے (اس میں صرف سورۃ الفاتحہ مکّی ہے‘ باقی سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائدۃ تقریباً سوا چھ پارے مدنی قرآن ہے) اسی طرح آخری گروپ اکثر و بیشتر مکّی قرآن پر مشتمل ہے (اس گروپ میں بالاتفاق تو صرف آخری دو سورتوں یعنی ’’معوذتین‘‘ کو ہی مدنی مانا گیا ہے)۔ پھر جس طرح دوسرا گروپ مکّی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے متوازن ہے (اس گروپ میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دو مکّی سورتیں ہیں‘ جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو ہی مدنی سورتیں ہیں) اسی طرح آخری سے پہلا یعنی چھٹا گروپ بھی اس لحاظ سے متوازن ہے کہ اس میں تقریباً ایک پارہ مکّی قرآن (سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ) اور تقریباً سوا پارہ مدنی قرآن (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) ہے۔

چھٹے گروپ کی مکّی سورتوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ لسانی اور ادبی محاسن کے اعتبار سے قرآن مجید کا خوبصورت ترین حصہ ان سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کا مخصوص صوتی آہنگ جسے میں Divine Music سے تعبیر کرتا ہوں‘ ان سورتوں میں تیز ردھم کے ساتھ اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ چھوٹی چھوٹی آیات میں خوبصورت الفاظ نگینوں کی طرح چمکتے دمکتے نظر آتے

ہیں۔ان ہی سورتوں میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ''عروس القرآن'' (قرآن کی دلہن) قرار دیا ہے۔ بہرحال فصاحت' بلاغت اور ادبی خوبیوں کے اعتبار سے ان سورتوں کو قرآن کے ذروۂ سنام (climax) کا درجہ حاصل ہے۔ان میں سورۂ قٓ بہت جامع اور اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد سورت ہے۔ باقی چھ سورتیں باہم جوڑوں کی شکل میں ہیں۔یعنی سورۃ الذاریات اور سورۃ الطور کا جوڑا' سورۃ النجم اور سورۃ القمر (ان میں چاند اور ستارے کی نسبت بھی ہے) کا جوڑا' اور سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا جوڑا۔

زیر مطالعہ (آخری) منزل کی مکّی سورتوں (سورۂ قٓ سے آخر تک) سے متعلق دو باتیں جو قبل ازیں بھی کئی مرتبہ دہرائی جا چکی ہیں یہاں موقع کی مناسبت سے ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔پہلی بات یہ کہ یہ تمام سورتیں حضور ﷺ کے مکّی دور کے ابتدائی چار برسوں میں نازل ہوئی ہیں اور دوسری یہ کہ ان سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدِّنظر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جو پہلا حکم ملا تھا وہ اِنذار کا تھا۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا۔ان آیات میں کوئی حکم نہیں آیا تھا۔اس کے بعد حضور ﷺ کو پہلا حکم سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲﴾ ''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو''۔یعنی لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ان کی دنیوی زندگی ہی بس اصل زندگی نہیں ہے کہ وہ کھائیں' پئیں' عیش کریں اور اس دنیا سے چلے جائیں' بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔اور جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اسی نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔نہ تو یہ کائنات ہمیشہ رہنے والی ہے اور نہ ہی کسی انسان کی زندگی دائمی ہے۔انسانی زندگی کی مہلت محدود مدّت کے لیے ہے۔ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔اس کے بعد تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہونا ہے اور دنیوی زندگی کے حوالے سے ایک بے لاگ محاسبے کا سامنا کرنا ہے۔اسی محاسبے کے بعد سزا یا جزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت سے غافل ہیں ان پر اس ''اِنذار'' کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔غالبؔ کا یہ شعر گویا انہی لوگوں کی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اسی وجہ سے قرآن میں ''انذارِ آخرت'' پر خصوصی زور دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے ''عقیدۂ آخرت'' کے لیے صرف ''ایمان'' کے لفظ کو کافی نہیں سمجھا گیا۔یعنی جہاں دوسرے عقائد کے لیے ''ایمان'' کا مطالبہ ہے وہاں ''آخرت'' کے لیے عام طور پر یقین (حقیقی ایمان) کا مطالبہ کیا گیا ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ (البقرۃ)۔عقیدۂ آخرت کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے اندر عملی اعتبار سے حقیقی مثبت تبدیلی اسی عقیدے کی بنا پر آتی ہے۔ بہرحال چھٹے اور ساتویں گروپ یعنی آخری منزل کی مکّی سورتوں کا مرکزی مضمون ''انذارِ آخرت'' ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں بہت مختصر انداز میں ''انباء الرسل'' کا تذکرہ بھی ہے اور مکّی سورتوں کے عمومی مضامین کی جھلکیاں بھی۔

آیات ۱ تا ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ
فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۚ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ
ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَ
عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ
اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا
وَزَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا
رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى
لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ
جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝۹ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝۱۰ رِّزْقًا
لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝۱۱ كَذَّبَتْ
قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝۱۲ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ
اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝۱۳ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ

الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾

آیت ۱ ﴿قٓ ۫ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ﴿۱﴾﴾ ''ق، قسم ہے عظیم الشان قرآن کی۔''

قرآن کی تین سورتیں ایسی ہیں جن کے آغاز میں صرف ایک ایک حرفِ مقطّعہ ہے۔ ان میں سورۂ قٓ کے علاوہ تیئسویں پارے کی سورۂ صٓ اور انتیسویں پارے کی سورۃ القلم (سورۂ نٓ) شامل ہیں۔ بہت سی دوسری سورتوں کے آغاز کی طرح اس سورت کے آغاز میں بھی قرآن مجید کی قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے۔ بہرحال چونکہ سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں قرآن حکیم کی قسم کا مقسم علیہ موجود ہے اس لیے اس قسم کا مقسم علیہ بھی وہی ہوگا، یعنی ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾﴾ (یٰسٓ)۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ (اے محمد ﷺ) قسم ہے اس عظیم الشان قرآن کی، بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں۔ اس قسم کے فوراً بعد دوسری آیت میں حضور ﷺ کا تعارف انذارِ آخرت کے حوالے سے کرایا گیا ہے جو اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔

آیت ۲ ﴿بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ ''بلکہ انہیں بہت عجیب محسوس ہوا ہے کہ ان کے پاس آیا ہے ایک خبردار کرنے والا ان ہی میں سے''

مُنْذِر کے معنی ہیں: انذار کرنے والا، خبردار (warn) کرنے والا۔

﴿فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۲﴾﴾ ''تو کافروں نے کہا یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔''

آیت ۳ ﴿ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ﴾ ''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹّی ہو جائیں گے (تو ہم پھر سے زندہ کیے جائیں گے؟)''

﴿ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴿۳﴾﴾ ''یہ لوٹا یا جانا تو بہت دور کی بات ہے۔''

مر کر مٹّی ہو جانے کے بعد ہمارا دوبارہ زندہ ہونا بالکل انہونی سی بات ہے، یہ بعید از قیاس دعویٰ کر کے یہ صاحب بہت دُور کی کوڑی لائے ہیں۔

آیت ۴ ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ﴾ ''ہم خوب جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کیا چیز کم کرتی ہے۔''

''ہم'' کے صیغے کے ساتھ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ انسانوں کے دفن ہونے کے بعد زمین

ان کے جسموں کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے، ہر انسان کا کون سا عضو کیسے ضائع ہوتا ہے اور پھر ان کے اجزاء کس کس صورت میں کہاں کہاں جاتے ہیں، ہمیں ایک ایک چیز کا علم ہے۔

﴿وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾﴾ ''اور ہمارے پاس تو ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی موجود ہے۔''

ہمارے پاس ایک ایک چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ ان کے جسموں کو ہم نے مٹّی سے پیدا کیا تھا اور ان کی موت کے بعد ان کے تمام اجزاء کو ہم مٹّی میں ہی محفوظ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن اسی مٹّی سے ہم انہیں نکال لیں گے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾﴾ (طٰہٰ)۔ اس کے علاوہ ان کے ایک ایک عمل کی پوری تفصیل بھی ہم نے لکھ رکھی ہے اور ان کی ارواح بھی ہمارے پاس عِلِّیّین یا سِجِّین میں موجود ہیں۔ غرض ان کی کوئی چیز بھی ہمارے علم یا قبضے سے باہر نہیں ہے۔

آیت ۵ ﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ﴾ ''بلکہ انہوں نے جھٹلا دیا حق کو جب کہ وہ ان کے پاس آیا''

﴿فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴿۵﴾﴾ ''سو اب وہ ایک بڑی اُلجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

ایک طرف تو جواب دہی اور احتساب کی باتیں ماننے کے لیے ان کی طبیعتیں آمادہ نہیں اور دوسری طرف اس بارے میں قرآن کی زبان میں حضور ﷺ کے دلائل ایسے قوی ہیں کہ انہیں جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں۔ بس یہی اُلجھن ہے جس میں یہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز اس حقیقت پر گواہ ہے اور اس کا مربوط و مستحکم نظام بھی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا خالق ایک علیم و حکیم ہستی ہے۔ پھر انسان کے اندر پائی جانے والی ''اخلاقی حس'' بھی اس کے اچھے بُرے اعمال کے ٹھوس اور حتمی نتائج کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے ایک دوسری زندگی کی ضرورت ہے۔ ان تمام حقائق و شواہد کی موجودگی میں ایک صاحبِ عقل اور ذی شعور انسان کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بس ''رام کی لیلا'' ہے اور انسان کی اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ چنانچہ منکرینِ آخرت کے لیے ان حقائق کو تسلیم کیے بغیر چارہ بھی نہیں، لیکن ان کی طبیعتیں ہیں کہ احتساب کے لیے تیار بھی نہیں۔ یہ انسان کی وہی نفسیاتی اُلجھن ہے جس کا ذکر غالبؔ نے اس شعر میں کیا ہے جو میں نے ابھی آپ کو سنایا ہے: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

ان لوگوں کے قلوب واذہان میں منفی خیالات ونظریات اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ اب ان سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ دراصل انسان اپنے لڑکپن کی عمر میں جن عقائد ونظریات کا اثر قبول کرتا ہے وہ ساری عمر کے لیے اس کی شخصیت کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ انسان کی اس کمزوری کا نقشہ ایک انگریزی نظم The Cage میں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم میں نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں پڑھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ان عادات کے ''پنجرے'' کا قیدی ہے جنہیں وہ لڑکپن کی عمر میں ایک ایک کر کے اپناتا ہے۔ گویا اس پنجرے کی سلاخیں اپنے لیے وہ خود تیار کرتا ہے۔ بقول شاعر:

"I built these bars when I was young"

''اس پنجرے کی سلاخیں میں نے اس وقت تیار کی تھیں جب میں جوان تھا''۔ جوانی میں انسان کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن پر نقش کالحجر بن جاتا ہے اور پھر اپنی باقی عمر وہ ان عادات ونظریات کا قیدی بن کر پنجرے میں قید پرندے کی مانند گزار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ منکرینِ آخرت بھی اپنے غلط عقائد ونظریات کے خود ساختہ پنجروں کے قیدی ہیں۔ ان پنجروں کی سلاخیں وہ اس قدر مضبوط کر چکے ہیں کہ اب انہیں توڑ کر باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

آیت ۶ ﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶﴾ ''تو کیا انہوں نے دیکھا نہیں آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور کیسے اسے مزیّن کیا ہے اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔''

اس آیت کی کما حقہٗ تشریح تو کوئی ماہر فلکیات ہی کر سکتا ہے۔ بہرحال آج کا انسان خوب جانتا ہے کہ ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا نظام بہت محکم ومربوط ہے اور یہ کہ اس نظام میں کسی رخنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

آیت ۷ ﴿وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ﴾ ''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور ہم نے اس میں لنگر ڈال دیے ہیں''

ماہرینِ طبقات الارض (Geologists) بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کی گردش

کے دوران اس کا توازن (isostacy) برقرار رکھنے میں پہاڑوں کا انتہائی اہم کردار ہے۔

﴿وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷﴾ ''اور ہم نے اس میں ہر طرح کی بڑی ہی رونق والی چیزیں (جوڑوں کی شکل میں) پیدا کر دیں۔''

آیت ۸ ﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸﴾ ''(یہ اللہ کی نشانیاں ہیں) سجھانے اور یاددہانی کرانے کو ہر اُس بندے کے لیے جو رجوع رکھے ہوئے ہو۔''

عَبْدٍ مُّنِيْبٍ سے ایسا بندہ مراد ہے جس کی روح اور فطرت کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی انسان کی فطرت سلیم اور روح زندہ ہو تب ہی یہ ''بصائر'' اس کے لیے مفید ہوں گے۔ ایسی صورت میں اسے کائنات میں بکھری اللہ کی نشانیاں نظر بھی آئیں گی اور ان نشانیوں سے اس کے دل میں خالق حقیقی کی ''یاد'' بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر کسی انسان کی فطرت مسخ اور روح مردہ ہو چکی ہو تو اس کا ''دیکھنا'' اور ''سننا'' اس کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

سورۃ الغاشیہ کی ان آیات کا انداز بھی اس حوالے سے بہت بصیرت افروز ہے:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝۱۷ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝۱۹ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝۲۰﴾

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں؟ اور زمین کو کہ کیسے بچھا دی گئی ہے؟''

یعنی پوری کائنات میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں، جو انسان کو قدم قدم پر یاد دلاتی ہیں کہ ہر چیز کا خالق اور صورت گر وہی ہے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ (الحشر: ۲۴) ''وہی ہے اللہ، پیدا کرنے والا، وجود بخشنے والا، صورتیں بنانے والا، تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

اقبال نے ''آیاتِ خداوندی'' کے مشاہدے کی دعوت ان الفاظ میں دی ہے: ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

آیت ۹ ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا﴾ ''اور ہم نے آسمان سے اُتارا برکت والا پانی''

لفظ ''برکت'' میں کسی چیز کی خفتہ صلاحیت کو ترقی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ

قبل ازیں بھی متعدد بار وضاحت ہو چکی ہے کہ بارش کا پانی زمین کی قوتِ نمو کو جلا بخشتا ہے اور اس کی روئیدگی کو اجاگر کرنے کا باعث بنتا ہے اور اسی پہلو سے یہ مبارک ہے۔

﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴾ ''تو ہم نے اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو اور ان فصلوں کو جو کٹ جاتی ہیں۔''

الفاظ کی یہ ترتیب منطقی اور بہت خوبصورت ہے۔ جَنّٰت سے درختوں کے باغات مراد ہیں اور درختوں کو کاٹا نہیں جاتا' صرف ان کے پھل اُتارے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اناج کی فصل (جیسے گندم کی فصل) پودوں سمیت کاٹ لی جاتی ہے' اس لیے اس کے لیے حَبَّ الْحَصِيْدِ کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴾ ''اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت جن کے خوشے ہیں تہ برتہ۔''

آیت ۱۱ ﴿رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ﴾ ''یہ سب رزق ہے بندوں کے لیے' اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مردہ زمین کو۔''

﴿كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝۱۱﴾ ''اسی طریقے سے نکلنا ہوگا (تمہارا بھی)۔''

جس طرح بارش کے پانی کے باعث خشک اور بنجر زمین سے طرح طرح کی نباتات اُگ آتی ہیں اسی طرح تم بھی ہمارے حکم سے زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔

آیت ۱۲ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ﴾ ''جھٹلایا تھا ان سے پہلے بھی نوحؑ کی قوم نے' کنویں والوں نے اور قومِ ثمود نے۔''

یہ انباء الرسل کا تذکرہ ہے لیکن انتہائی مختصر انداز میں۔

آیت ۱۳ ﴿وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ﴾ ''اور قومِ عاد' فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ﴾ ''اور بن والوں اور قومِ تُبّع نے۔''

بن والوں سے یہاں اہلِ مدین مراد ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ''تُبّع'' شاہانِ یمن کا لقب تھا۔ قبل ازیں سورۃ الدخان کی آیت ۳۷ میں بھی ہم قومِ تُبّع کا ذکر پڑھ آئے ہیں۔

﴿كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝۱۴﴾ ''ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو وہ مستحق ہو گئے میری وعید کے۔''

پیغمبروں کو جھٹلا کر وہ لوگ عذاب کی وعیدوں کے مصداق بن گئے۔

آیت ۱۵ ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ﴾ ''تو کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے عاجز آ گئے ہیں!''

کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں (creative potential) اب ختم ہو کر رہ گئی ہیں اور اب ہم انہیں دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ الاحقاف میں اس طرح آیا ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۳﴾

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں' وہ اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے! کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۵﴾ ''بلکہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں نئی تخلیق سے متعلق۔''

ہماری خلاقی کی قدرت میں تو کوئی کمی نہیں آئی' البتہ یہ لوگ اپنے ذہنوں کی تنگی کی وجہ سے پریشان ہیں اور مبتلائے شک ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر لیا جائے گا!

آیات ۱۶ تا ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝۱۷ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝۱۹ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝۲۰ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝۲۱ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ

مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ وَ
قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ
عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ
وَ لٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ
قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ
هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ هٰذَا
مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ
جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

آیت ۱۶ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔''

یہ اُس قوتِ شر کا ذکر ہے جو انسان کے اندر ہے۔ نفسِ انسانی کے شر کا ذکر سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾﴾ ''اور میں اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتا' یقیناً (انسان کا) نفس تو بُرائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے''۔ فطری طور پر انسان کے اندر داعیہ خیر بھی ہے اور داعیہ شر بھی۔ انسان کی اندرونی قوتِ شر کو سورۂ یوسف کی اس آیت میں ''نفسِ اَمّارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ فرائیڈ اسے id یا libido کہتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر خیر کی قوت اس کی روح ہے جس کا مسکن قلبِ انسانی ہے۔ انسان کی روح اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس داعیہ یا قوت کو فرائیڈ super ego کا نام دیتا ہے' یعنی ego (انسانی انا) کا اعلیٰ درجہ۔ فرائیڈ کے دیے ہوئے یہ عنوانات تو کسی حد تک ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں' لیکن ان عنوانات کی تشریح جو اُس نے کی ہے اسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اس حوالے سے کئی مرتبہ پہلے بھی بیان ہو چکی

ہے کہ مغربی سائنسدان اور فلاسفرز سب کے سب ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف ''عالَمِ خلق'' یعنی اسباب و علل کی دنیا سے واقف ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مادی دنیا کے اَسرار و رموز کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کے ایسے معیار قائم کیے ہیں کہ انسانی عقل واقعی دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ''عالَمِ امر'' کے بارے میں وہ بالکل اندھے اور کورے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں روح' وحی اور فرشتے وغیرہ کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''انسان'' کے بارے میں ان کے فلسفیانہ تجزیے اکثر درست نہیں ہوتے۔ بہرحال آیت زیرِ مطالعہ میں انسان کے اندر موجود قوتِ شر (نفسِ اَمّارہ) کا ذکر ہے کہ انسان کا نفس اسے جو پٹیاں پڑھاتا ہے اس کی تفصیلات اس کے خالق سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو اُس سے اُس کی رَگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قرب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے' بقول شاعر یہ قرب ''بے تکیّف و بے قیاس'' ہے: ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قرب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس ''معیت'' کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر بھی ہے' اس کا چہرہ کیسا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ وہ کیسے نزول فرماتا ہے؟ ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے معاملات میں خواہ مخواہ کا تجسس ہمیں فتنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں آخری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ''عالَمِ امر'' اور اس کی کیفیات ہماری سمجھ سے وراء الوراء ہیں۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ اور عقل و شعور کے ذریعے جو علم حاصل کر سکتے ہیں اس کا تعلق ''عالَمِ خلق'' سے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی ''دائرے'' میں رہتے ہوئے' سوچیں سمجھیں' تحقیق کریں' نتائج اخذ کریں اور ان نتائج کو بروئے کار لائیں۔ دوسری طرف ''عالَمِ امر'' سے متعلق جو معلومات وحی کے ذریعے ہم تک پہنچیں انہیں من و عن تسلیم

کرلیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے الفاظ ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ میں اسی طرزِ عمل کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جان سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس قرب کی منطق اور کیفیت کے بارے میں ہمیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت ۱۷ ﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝۱۷﴾ ''جبکہ لیتے جاتے ہیں دو لینے والے جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوتے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کے ہر فعل اور عمل کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ سورۃ الانفطار' آیت ۱۱ میں ان فرشتوں کو 'کِرَامًا کَاتِبِیْنَ' کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ ''وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اُس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

یعنی کوئی انسان جو لفظ بھی اپنی زبان سے بولتا ہے متعلقہ فرشتہ اس کو فوراً ریکارڈ کر لیتا ہے اور ظاہر ہے فرشتوں کی یہ ریکارڈنگ بھی عالمِ امر کی چیز ہے' اس لیے اس کی کیفیت بھی ہمارے تصوّر میں نہیں آسکتی۔ ریکارڈنگ کے شعبے میں گزشتہ چند دہائیوں میں انسانی سطح پر جو ترقی دیکھنے میں آئی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب انسان کی ''ریکارڈنگ'' کا معیار یہ ہے اور اس معیار میں مزید ترقی بھی رُکنے کا نام نہیں لے رہی تو اللہ کی قدرت سے جو ریکارڈنگ ہو رہی ہے اُس کا معیار کیا ہوگا!

آیت ۱۹ ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ﴾ ''اور بالآخر موت کی بے ہوشی کا وقت آن پہنچا ہے حق کے ساتھ۔''

موت کا آنا تو قطعی اور برحق ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ اللہ کے منکر تو بہت ہیں لیکن موت کا منکر کوئی نہیں۔

﴿ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝۱۹﴾ ''یہی ہے ناوہ چیز جس سے تو بھاگا کرتا تھا!''

اس بات کا انسان کی نفسیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ ہر انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ موت کو برحق جانتے ہوئے بھی وہ اس کے تصوّر کو حتی الوسع اپنے ذہن سے دور رکھنے کی کوشش

میں رہتا ہے۔ وقتی طور پر اگر کسی عزیز کی موت اور تجہیز و تکفین کے موقع پر اپنی موت اور قبر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے تو انسان فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر روزمرہ کے معمولات میں خود کو مصروف کر لیتا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝۲۰﴾ ''اور صُور میں پھونکا جائے گا' یہ ہے وعدے کا دن!''

پہلے انفرادی موت کی بات کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں پوری دنیا کی اجتماعی موت کا ذکر ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کے لیے تو گویا وہی قیامت ہے۔ اس لیے انسان کی انفرادی موت کو قیامتِ صُغریٰ اور تمام انسانوں کی اجتماعی موت کو قیامتِ کُبریٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیت میں قیامتِ صُغریٰ کا بیان تھا' اب یہاں قیامتِ کُبریٰ کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۝۲۱﴾ ''اور ہر جان آئے گی (اس حالت میں کہ) اس کے ساتھ ہوگا ایک دھکیلنے والا اور ایک گواہ۔''

دنیا میں ہر انسان کے ساتھ جو دو فرشتے (کِرَامًا کَاتِبِیْنَ) مامور ہیں وہی قیامت کے دن اسے لا کر اللہ کی عدالت میں پیش کریں گے۔ ان میں سے ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ اٹھائے ہوئے ہوگا جب کہ دوسرا اسے عدالت کی طرف دھکیل رہا ہوگا۔

آیت ۲۲ ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ ''(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا!''

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝۲۲﴾ ''تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے' تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہوگئی ہے۔''

دنیا میں رہتے ہوئے بہت سے حقائق تمہارے لیے پردۂ غیب میں تھے۔ وہاں تجھ سے مطالبہ تھا کہ ان حقائق پر بغیر دیکھے ایمان لاؤ۔ آج غیب کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور اب تمہاری نظر ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے' حتیٰ کہ آج تم اپنے ساتھ آنے والے فرشتوں کو بھی دیکھ رہے ہو۔

آیت ۲۳ ﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝۲۳﴾ ''اور اُس کا ساتھی کہے گا: (پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا' حاضر ہے!''

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں ''ساتھی'' سے فرشتہ مراد ہے' لیکن میں ان لوگوں سے متفق

ہوں جو اس سے شیطان مراد لیتے ہیں۔ دراصل خیر اور شر کی قوتیں انسان کے اندر بھی موجود ہیں اور خارج میں بھی۔ اندر سے انسان کا نفس اسے بُرائی پر اُبھارتا ہے‘ جبکہ خارج میں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی مامور ہے جو اس کے نفس میں ہر وقت وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر اس کی روح ’’داعیٔ خیر‘‘ کے طور پر موجود ہے جبکہ خارج میں اس حوالے سے فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ اور ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو نیکی کے کاموں میں انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ﴾۔ فرشتوں کی معیت کے باعث ہی کوئی نیک کام کر کے ہمیں خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر فرشتے دراصل ہمیں بشارت اور شاباش دے رہے ہوتے ہیں جس کے اثرات ہماری روح پر طمانیت کی صورت میں مرتّب ہوتے ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۲۴﴾ ’’(اللہ تعالیٰ فرمائے گا:) جھونک دو جہنّم میں ہر ناشکرے سرکش کو۔‘‘

یہ حکم گویا اس انسان اور اس کے ساتھی شیطان دونوں کے لیے ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝۲۵﴾ ’’جو خیر سے روکنے والا‘ حد سے بڑھنے والا اور شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿نِ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ’’جس نے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی بنا لیا تھا۔‘‘

﴿فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝۲۶﴾ ’’تو جھونک دو اس کو بڑے سخت عذاب میں۔‘‘

اس انسان کا شیطان یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی اپنی حیثیت ’’سرکاری کارندے‘‘ کی ہے جو مجرم کو سزا کے لیے لے کر آیا ہے‘ لیکن دونوں کو جہنّم رسید کرنے کا حکم سن کر وہ فوراً اپنی صفائی میں چلّانا شروع کر دے گا۔

آیت ۲۷ ﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۲۷﴾ ’’اُس کا ساتھی (شیطان) کہے گا: پروردگار! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا‘ بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔‘‘

گویا وہ چاہے گا کہ جو انسان اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اُسے سزا کے لیے وصول کر لیا جائے

اور خود اس کی جان بخشی کر دی جائے۔

آیت ۲۸ ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝۲۸﴾ ’’(اللہ فرمائے گا:) اب میرے سامنے جھگڑا مت کرو‘ جبکہ میں پہلے ہی تمہاری طرف وعید بھیج چکا ہوں۔‘‘

کہ میں نے تو جن و انس پر ’’انذار‘‘ کے حوالے سے اتمامِ حُجّت کر دیا تھا۔ سورۃ الاحقاف میں ان جِنّات کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر داعیانِ حق بن کر اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گویا قرآن کا پیغام اور انذار جِنّات تک بھی پہنچا دیا گیا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۲۹﴾ ’’میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جا سکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔‘‘

چنانچہ اب میرے قانون کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

آیت ۳۰ ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ﴾ ’’جس دن ہم پوچھیں گے جہنّم سے کہ کیا تو بھر گئی؟‘‘

﴿وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝۳۰﴾ ’’اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟‘‘

یعنی وہ کہے گی کہ ابھی تو میرے اندر بہت گنجائش ہے۔ ابھی مزید جنّوں اور انسانوں کو میرے اندر ڈالا جائے تاکہ میں بھر جاؤں۔

آیت ۳۱ ﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ۝۳۱﴾ ’’اور جنّت قریب لائی جائے گی اہلِ تقویٰ کے لیے‘ کچھ بھی دُور نہیں ہوگی۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ ’’(ان سے کہا جائے گا:) یہ ہے جس کا وعدہ تم لوگوں سے کیا جاتا تھا‘‘

﴿لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ۝۳۲﴾ ’’ہر اُس شخص کے لیے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہو۔‘‘

یعنی اس امانت کی حفاظت کرنے والا جو ہم نے اس کے سپرد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان

میں جو روح پھونکی ہے وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے‘ جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے :﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ﴾ (آیت ۷۲) ’’ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اُٹھا لیا‘‘۔ چنانچہ ’’حَفِیْظ‘‘ سے ایسا شخص مراد ہے جس نے اس امانت کا حق ادا کیا اور اپنی روح کو گناہ کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔ سورۃ الشعراء میں ایسی محفوظ اور پاکیزہ روح کو ’’قلبِ سلیم‘‘ کا نام دیا گیا ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ ’’جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اُس کے جو آئے اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر‘‘۔ اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ کی تشریح۔

آیت ۳۳ ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ ’’جو ڈرتا رہا رحمٰن سے غیب میں ہونے کے باوجود۔‘‘

﴿وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور لے کر آیا رجوع کرنے والا دل۔‘‘

قلبِ منیب سے بھی یہاں قلبِ سلیم ہی مراد ہے۔ یہ ایسے شخص کا ذکر ہے جو دنیا میں اللہ ربّ العزّت کا فرمانبردار بندہ بن کر رہا۔ اللہ کی امانت کو اُس نے پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ رکھا اور صحیح وسلامت حالت میں لوٹایا۔

آیت ۳۴ ﴿اِدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾﴾ ’’(ان سے کہا جائے گا:) داخل ہو جاؤ اس (جنّت) میں سلامتی کے ساتھ‘ اب یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔‘‘

اب ایسا کوئی مرحلہ نہیں آئے گا کہ تمہیں جنّت سے نکلنا پڑے۔

آیت ۳۵ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾﴾ ’’ان کے لیے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے‘ اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے۔‘‘

قرآن کے مختلف مقامات پر جنّت کی نعمتوں کا جو تعارف ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت کی نعمتوں کے تین درجے ہیں۔ نفسِ انسانی کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کا بھرپور سامان تو جنّت میں پہلے سے موجود ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر شخص اپنی پسند‘ ذوق اور خواہش کے مطابق جو کچھ

طلب کرے گا وہ بھی اسے فراہم کیا جائے گا۔ ظاہر ہے ہر شخص کی طلب اپنے ذوق اور معیار کے مطابق ہوگی۔ ایک سادہ لوح دیہاتی اپنی پسند کے مطابق کوئی چیز مانگے گا اور ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کی تسکین چاہے گا۔ البتہ اس حوالے سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کچھ بھی طلب نہیں کریں گے‘ وہ لوگ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الکہف:۲۸) کے مصداق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا کے طالب ہوں گے۔ جیسے رابعہ بصریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ جذب کے عالَم میں ایک مشعل اور پانی کا لوٹا لیے گھر سے نکلیں۔ لوگوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں اس آگ سے جنّت کو جلانے نکلی ہوں اور اس پانی سے میں جہنّم کی آگ کو بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ سے خالص اُس کی ذات کے لیے محبّت کریں نہ کہ جنّت کے لالچ اور جہنّم کے خوف کی وجہ سے اسے چاہیں۔ بہرحال جنّت میں وہ لوگ بھی ہوں گے جنہیں اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے ہوگا۔ جبکہ ان دو اقسام کے علاوہ تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہوں گی جو انسانی تصوّر سے بالاتر ہیں اور آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ’’وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ‘‘ میں انہی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سورۃ السجدۃ میں جنّت کی ان نعمتوں کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ﴾ (آیت ۱۷) ’’پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہل جنّت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے‘‘۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ، فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ : فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ)) (۱)

’’اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنّت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا:) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ’’پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہلِ جنّت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔‘‘

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ و صحیح مسلم‘ کتاب الجنة و صفة نعیمها و اهلها۔

آیات ۳۶ تا ۴۵

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي
الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ
قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ
وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَ
اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ
الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ
وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ
حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ
بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾

آیت ۳۶ ﴿وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾﴾ ’’اور کتنی ہی قوموں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے جو قوت میں ان سے بڑھ کر تھیں‘ سو انہوں نے ملکوں کے ملک فتح کیے! پھر کیا وہ کوئی جائے فرار پا سکے؟‘‘

نَقَبَ کا معنی ہے نقب لگانا‘ یعنی دیوار میں سوراخ کرنا‘ جبکہ نَقَّبَ فِی الْاَرْضِ (باب تفعیل) کا مفہوم ہے: بھاگ دوڑ کرتے ہوئے کسی ملک میں جا گھسنا‘ یعنی کسی علاقے کو فتح کر لینا۔ وہ لوگ اتنے زور آور تھے کہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں گھستے چلے گئے اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے‘ لیکن جب اللہ کی پکڑ آئی تو انہیں بھاگنے کو جگہ نہ ملی۔

آیت ۳۷ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾﴾

’’یقیناً اس میں یاددہانی ہے اُس کے لیے جس کا دل ہو یا جو توجّہ سے سنے حاضر ہو کر۔‘‘

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کا بہت اہم مقام ہے۔ یاددہانی کے حوالے سے اس آیت میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہ یاددہانی یا تو ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو ’’دل‘‘ رکھتے ہیں‘ یا پھر وہ جو پوری توجّہ سے اس کو سنیں۔ گویا یہاں قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے دو الگ الگ طریقوں اور راستوں (approaches) کا ذکر ہے۔ ایک ان لوگوں کا راستہ ہے جو دل رکھتے ہیں۔ یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کی روح زندہ ہے۔ روح کا مسکن چونکہ قلبِ انسانی ہے اس لیے جس انسان کی روح زندہ ہوگی اس کا دل بھی زندہ ہوگا۔ ایسے دل کو دلِ بیدار‘ دلِ زندہ یا قلبِ سلیم کہا جاتا ہے۔ میر درد نے اپنے اس شعر میں دل کی اسی ’’زندگی‘‘ کا ذکر کیا ہے: ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے![۲]

چنانچہ ایک زندہ دل شخص جب قرآن سنے گا تو اس شخص کی روح یوں لپک کر قرآنی پیغام تک پہنچ جائے گی جیسے پٹرول دور سے آگ پکڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت کو سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ﴾ ’’قریب ہے کہ اس کا روغن خود بخود روشن ہو جائے‘ چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو‘‘۔ گویا ایک پاکیزہ روح نورِ وحی تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

۲۔ علّامہ اقبال کے کلام میں بھی جا بجا دلِ بیدار‘ دلِ زندہ‘ دلِ مردہ‘ دلِ بینا اور قلبِ سلیم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ’’بالِ جبریل‘‘ میں انہوں نے ’’دلِ بیدار‘‘ کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

دلِ بیدار فاروقی‘ دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری‘ نہ میری ضرب ہے کاری!

حافظ ابن قیمؒ نے اس بارے میں بڑی خوبصورت بات لکھی کہ بہت سے لوگ قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے قرآن ان کے دل پر نقش ہے اور وہ اس کی عبارت کو مصحف سے نہیں بلکہ اپنی لوحِ قلب سے پڑھ رہے ہیں۔ یعنی سلیم الفطرت لوگوں کی ارواح کو قرآن حکیم کے ساتھ خصوصی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی روحوں میں ایک مانوس قسم کا ارتعاش (sympathetic vibration) پیدا ہوتا ہے۔ گویا ان کی ارواح قرآنی الفاظ و آیات کے ساتھ پہلے سے ہی مانوس ہیں۔ بقول غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

ایسے لوگوں کو قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے لیے کسی مہلت یا تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے قبولِ حق میں ایک لمحے کا توقف بھی نہیں کیا تھا۔

اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ارواح پر غفلت اور مادیت کے پردے پڑ چکے ہوں‘ ان کے لیے اس آیت میں دوسرا طریقہ بتایا گیا ہے: ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾۔ یعنی ان لوگوں کو خصوصی توجّہ کے ساتھ محنت کرنا ہوگی‘ تب کہیں جا کر ’’گوہرِ مقصود‘‘ تک ان کی رسائی ہوگی۔ مطالعہ قرآن کے ہمارے منتخب نصاب میں ایمان کی بحث کے تحت دو دروس (درس ۶ اور ۷) ایسے ہیں جو انہی دو طریقوں کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں پہلا درس سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں آیاتِ آفاقی کے مشاہدے کی بنیاد پر تفکّر و تدبّر کی دعوت دی گئی ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں‘ کھڑے بھی‘ بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور مزید غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے

ہمارے ربّ! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔ تُو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)‘ پس تُو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!‘‘

لیکن یہ تفکّر و تدبّر تب نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے ساتھ اللہ ربّ العالمین کے ذکر کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ذکر اور فکر دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا‘ جیسا کہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر
جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است

یعنی فقرِ قرآن تو ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے جبکہ مَیں ذکر کے بغیر فکر کو ناقص اور نامکمل دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی شیر بھی ہو تو قرآن کے بغیر وہ لومڑی کی طرح ہوگا‘ اصل شہنشاہ تو وہ ہے جسے فقرِ قرآنی مل گیا۔

اس ضمن میں ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذکر اور فکر کے الگ الگ حلقے بن چکے ہیں۔ ان میں سے ہر حلقے کے لوگ اپنے طور طریقوں میں اس قدر مگن ہیں کہ انہیں دوسروں سے کچھ سروکار نہیں۔ ایک طرف مفکّرین ہیں جو فلسفہ و فکر پر بڑی بڑی کتابیں رقم کر رہے ہیں‘ کیسی کیسی تفسیریں لکھتے جاتے ہیں‘ مگر وہ ذکر کی لذّت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ دوسری طرف ذاکرین ہیں جو ذکر کی روح پرور محفلیں سجاتے ہیں لیکن انہیں فکر و تدبّر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ظاہر ہے گاڑی کے ان دونوں پہیوں میں ہم آہنگی ہوگی تو اُمّت کا قافلہ منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ بہرحال سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ آیات میں ذکر و فکر کے ذریعے ہدایت کی ’’منزلِ مقصود‘‘ تک پہنچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے‘ جبکہ دوسرے طریقے کی نشاندہی سورۃ النور کے پانچویں رکوع (منتخب نصاب کے درس ۷) میں کی گئی ہے کہ اپنے قلب کو صاف کر لیجیے‘ اس کی تمام کدورتیں دور کر دیجیے تو اس کے آئینے میں قرآن خود بخود منعکس ہو کر اسے منور (نُورٌ عَلٰی نُور) کر دے گا اور یوں نورِ فطرت اور نورِ وحی کے امتزاج سے نورِ ایمان کی تکمیل ہو جائے گی۔

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۫﴾ ’’اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے پیدا کیا چھ دنوں میں۔‘‘

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝۳۸﴾ ’’اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی۔‘‘

یہ مضمون موجودہ تورات میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تھکن دور کی۔ اسی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ''ویک اینڈ'' کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کیا تھا' لہٰذا تم لوگ بھی چھ دن کام کر کے ساتویں دن آرام کرو۔ اس آیت میں دراصل تورات کے اس تصوّر کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ اسلام میں ''ویک اینڈ'' کا کوئی تصوّر نہیں۔ اس حوالے سے یہ تاریخی حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ اصل تورات بخت نصر کے حملے میں گم ہوگئی تھی اور دوبارہ اس کو یادداشتوں کی مدد سے مرتّب کیا گیا تھا۔ مرتّبین چونکہ عام انسان تھے' نبی نہیں تھے' اس لیے ان کی یادداشتوں نے ٹھوکریں کھائیں اور بہت سی غلط باتیں بھی اس میں شامل کر دی گئیں۔

آیت ۳۹ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) آپ صبر کیجیے اس پر جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝۳۹﴾ ''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل۔''

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے' زیر مطالعہ سورتیں مکّی دور کے ابتدائی چار سال کے دوران نازل ہوئی تھیں۔ اُس وقت تک پنج گانہ نماز کا باقاعدہ نظام وضع نہیں ہوا تھا۔ پنج گانہ نماز تو معراج کے موقع پر (۱۰ نبویؐ میں) فرض ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو بس صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے کی بار بار تلقین و تاکید کی جاتی تھی' جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں یا اس سے بھی پہلے سورۃ المزمل میں رات کی نماز اور اس میں تلاوتِ قرآن کا حکم آ چکا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ اوقات کے ساتھ پانچ نمازوں کا نظام وضع ہوا تو ان دو اوقات میں دو نمازیں فرض ہوگئیں' یعنی قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ کے اوقات میں فجر کی نماز اور قَبْلَ الْغُرُوْبِ کے وقت میں نمازِ عصر۔

آیت ۴۰ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ ''اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح بیان کرو۔''

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝۴۰﴾ ''اور سجدوں (نمازوں) کے بعد بھی۔''

یہ گویا نماز سے فارغ ہونے کے بعد کی تسبیح و تحمید کا حکم ہے۔ نمازوں کے بعد کے اذکار کی

تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں' جیسے تسبیح فاطمہؓ (۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ یا ۳۳ بار اللہ اکبر پڑھنا) کی مداومت سے متعلق احادیث میں ترغیب آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝۴۱﴾ ''اور کان لگائے رکھو جس دن پکارنے والا پکارے گا بہت قریب کی جگہ سے۔''

یعنی اس دن کے منتظر رہو جب صُور میں پھونکا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی آواز بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوگی۔ صُور کی آواز ایسی زوردار اور خوفناک ہوگی کہ اس سے ہر جان دار کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد سب انسانوں کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرنے کے لیے پھر صور پھونکا جائے گا۔ یہاں اسی دوسرے صور کا ذکر ہے۔

آیت ۴۲ ﴿يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''جس دن کہ وہ سنیں گے ایک چنگھاڑ حق کے ساتھ۔''

﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝۴۲﴾ ''وہ ہوگا نکلنے کا دن۔''

یعنی وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ﴾ ''یقیناً ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت وارد کرتے ہیں۔''

﴿وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۝۴۳﴾ ''اور ہماری ہی طرف (سب کو) پلٹ کر آنا ہے۔''

واضح رہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ جلالت کا زیادہ اظہار کرنا چاہتا ہے وہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ پسند فرماتا ہے۔

آیت ۴۴ ﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ﴾ ''جس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے نکل پڑیں گے۔''

﴿ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ۝۴۴﴾ ''یہ (سب کا) جمع کر دینا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

(باقی صفحہ 64 پر)

اسلام پر دجّالیت کا تازہ حملہ

بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ایک فکر انگیز خطاب

بمقام: قرآن آڈیٹوریم لاہور (۷ مئی ۲۰۰۶ء)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾﴾ (النساء)

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ : ((بَدَأَ الۡاِسۡلَامُ غَرِیۡبًا وَسَیَعُوۡدُ کَمَا بَدَأَ غَرِیۡبًا ، فَطُوۡبٰی لِلۡغُرَبَاءِ))
(رواہ مسلم والترمذی وابن ماجہ واحمد والدارمی رحمھم اللہ)

احادیثِ نبویہ میں ''دجّالِ اکبر'' کے عنوان سے جس معیّن شخصیت کا ذکر ہے اس کا تو ابھی ظہور نہیں ہوا' اگرچہ یہ اب زیادہ دُور بھی معلوم نہیں ہوتا' لیکن انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ: Coming events cast their shadows before یعنی مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے سائے پہلے سے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت اس بات سے بحث نہیں ہے کہ دجالِ اکبر کب ظاہر ہو گا' کس شکل میں آئے گا' کہاں سے آئے گا؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دجّالیت یعنی فتنۂ دجّال کئی صدیوں سے نہ صرف شروع ہو چکا ہے' بلکہ اس کے سائے رفتہ رفتہ تدریجاً گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اب یہ فتنہ میرے نزدیک اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔

کفر اور دجّالیت کی ایک اہم صورت: تفریق بین اللہ والرسل

دجّالیت کی بہت سی صورتیں ہیں' جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ کفر کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک کفر مشرکین کا تھا' ایک کفر اہلِ کتاب کا تھا اور ایک کفر منافقین کا تھا جو بظاہر مسلمان اور بباطن کافر تھے۔ اسی طرح شرک کی ہزاروں قسمیں اور ہزاروں صورتیں ہیں۔ اس پر ''حقیقت واقسامِ شرک'' کے عنوان سے میری مفصل تقاریر موجود ہیں اور یہ سلسلہ مضامین میثاق میں شائع بھی ہو چکا ہے☆۔ اسی طرح دجّالیت کی بھی بہت سی صورتیں' بہت سے shades اور بہت سے مراحل ہیں۔ اس کی ایک خاص صورت جو اس آخری مرحلے میں سامنے آ رہی ہے' وہ ہے ''تفریق بین اللّٰہِ والرُّسُل''' یعنی اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا' کہ اللہ کو مانیں گے لیکن رسول کو نہیں مانیں گے' یا مانیں گے تو اطاعت نہیں کریں گے' اتباع نہیں کریں گے' پیروی نہیں کریں گے۔ اس کے حوالے سے سورۃ النساء کی دو آیات کی تلاوت کی گئی ہے۔ پہلے ہم ان آیات کا لفظ بلفظ مطالعہ کرتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسولوں کا کفر کرتے ہیں'' ﴿وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ﴾ ''اور چاہتے یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق پیدا کر دیں'' ﴿وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ﴾ ''اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے'' ___ بعض پیغمبروں پر ایمان رکھیں گے اور بعض کا کفر کریں گے۔ ﴿وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾﴾ ''اور وہ چاہتے یہ ہیں کہ اس کے بین بین ایک راستہ اختیار کریں۔''

﴿اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ﴾ ''یہ لوگ کٹر کافر ہیں''۔ چاہے یہ ایمان باللہ کا دعویٰ کریں' چاہے اللہ کی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کریں' لیکن اگر رسول کا انکار ہو یا رسول کی

☆ ''حقیقت واقسامِ شرک'' پر محترم ڈاکٹر صاحب ؒ کے خطابات اب کتابی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔ (مرتّب)

اطاعت اور اتباع کا انکار ہو تو یہ کفر ہے‘ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾﴾ ’’اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے‘‘۔

اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لوگوں کا ذہن عام طور پر ’’تفریق بین الرسل والانبیاء‘‘ کی طرف جاتا ہے‘ یعنی رسولوں میں سے بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا۔ یہ بھی یقیناً کفر ہے‘ اور یہ قرآن مجید کے مستقل مضامین میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جن انبیاء و رُسل علیہم السلام کا ذکر قرآن میں موجود ہے ان کو تعین کے ساتھ ماننا ضروری ہے اور ان میں سے کسی ایک کا انکار سب کا انکار ہو جائے گا۔ ان کے علاوہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ دنیا میں اور بہت سے نبی اور رسول آئے ہیں‘ جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے‘ جیسا کہ ارشاد ہوا: ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ﴾ (النساء:۱۶۴) ’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) بہت سے رسول ایسے ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے آپ کے سامنے کیا ہے اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے آپ کے سامنے نہیں کیا‘‘۔ لیکن اجمالاً ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ تفریق بین الرسل کے مضمون کے لیے قرآن حکیم کے دو مقامات کا حوالہ پیش کر رہا ہوں۔ سورۃ البقرۃ کے سولہویں رکوع میں فرمایا گیا:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾﴾

’’(اے مسلمانو!) کہو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر‘ اور اُس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو (ہم سے پہلے) نازل کیا گیا ابراہیمؑ‘ اسمٰعیلؑ‘ اسحاقؑ‘ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب پر‘ اور جو کچھ دیا گیا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور تمام نبیوں کو اُن کے ربّ کی طرف سے۔ ہم ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان بھی تفریق نہیں کرتے (تمام نبیوں کو مانتے ہیں) اور ہم اُسی (اللہ) کے مطیع فرمان ہیں۔‘‘

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آخری سے پہلی آیت میں فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫﴾ ’’ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے‘‘۔ چنانچہ تفریق بین الانبیاء والرسل بھی قرآن کا ایک مستقل موضوع ہے۔ البتہ آیت زیر مطالعہ پر خصوصی توجّہ کی ضرورت ہے۔ یہاں اصلاً جو بات سامنے آ رہی ہے وہ ہے ’’تفریق بین اللہ والرسل‘‘ یعنی اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق کر دینا۔ اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرنا لیکن رسولوں کو ماننے سے انکار کر دینا‘ یا ماننا تو ان کے اتباع اور اطاعت سے انکار کر دینا۔ درحقیقت اس وقت دجّالیت کا جو سب سے بڑا سیلاب آ رہا ہے‘ اس کا اصل ہدف یہی ہے کہ اسلامی تہذیب کے جو بچے کھچے اثرات رہ گئے ہیں ان کا صفایا کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے اس کا حربہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان تفریق ہے۔

تفریق بین اللہ والرسل کا تاریخی جائزہ

پہلے مَیں تفریق بین اللہ والرسل کی تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر رہا ہوں:

(۱) یہود کا انکارِ رسالت: اس کا اوّلین مظاہرہ آغازِ اسلام ہی میں یہود کی طرف سے ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں‘ یومِ آخرت کو مانتے ہیں‘ لہٰذا ہمیں بھی مسلمان مانو‘ صاحبِ ایمان تسلیم کرو۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں اگرچہ منافقین کا تذکرہ بھی ہے‘ لیکن یہاں اصلاً یہود کا ذکر ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾

’’لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر‘ لیکن وہ ہرگز مؤمن نہیں ہیں۔ یہ لوگ (اپنے تئیں) دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو‘ حالانکہ وہ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے (انہیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں)۔ ان کے دلوں میں روگ ہے‘ سو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا ہے‘ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے‘ اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔‘‘

تو یہ یہود کی طرف سے دعویٰ تھا۔ خاص طور پر مدنی دَور کے ابتدائی سولہ سترہ ماہ کے دوران جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اُس وقت ابھی یہودیوں کے کان کھڑے نہیں ہوئے تھے کہ یہ کوئی نیا دین آ گیا ہے‘ یا یہ کسی نئی اُمّت کی تأسیس ہو رہی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ تو ہمارے ہی قبلے کی پیروی کر رہے ہیں‘ گویا ہمارے ہی Camp-followers ہیں۔ اسی سے ہمت پا کر ان کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ہمیں بھی مانو کہ ہم مسلمان ہیں‘ مؤمن ہیں‘ ہم اللہ کو مانتے ہیں‘ آخرت کو مانتے ہیں‘ اگر محمد (ﷺ) کو نہیں مانتے تو کون سی بڑی بات ہے؟ بہرحال قرآن مجید نے فتویٰ دے دیا کہ یہ کافر ہیں‘ مؤمن ہرگز نہیں ہیں‘ یہ دھوکہ دے رہے ہیں‘ ان کے دلوں میں تکبّر کا مرض ہے‘ اور اسی تکبّر کی وجہ سے یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مان رہے۔ ارشاد ہوا کہ اللہ نے ان کے اس مرض میں اضافہ کر دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

(۲) منافقین کا طرزِ عمل: تفریق بین اللہ والرسل کا دوسرا مظہر نفاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مدینہ کے منافقین پورا زور دے کر کہتے تھے کہ اے محمد (ﷺ)! ہم آپ پر ایمان رکھتے ہیں‘ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہم آپ کو ہر معاملے میں حَکم بھی تسلیم کریں؟ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم آپ کا ہر حکم بھی مانیں؟ آپؐ کی رسالت کا کام پورا ہو گیا‘ آپؐ نے قرآن کی صورت میں اللہ کی کتاب ہمیں لا کر دے دی‘ اب جو کچھ قرآن میں ہو گا اس کو تو ہم مانیں گے‘ لیکن یہ کہ آپ کا حکم‘ آپ کا قول‘ آپ کا فرمان‘ آپ کا قانون ہم کیوں مانیں؟ چنانچہ آپ دیکھئے سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں منافقین کا قول نقل ہوا ہے اور وہ کس شدّومدّ کے ساتھ ایمان بالرسول کا ذکر کر رہے ہیں:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾

”(اے نبی ﷺ!) آپ کے پاس جب یہ منافق آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے (اللہ سے

بڑھ کر اور کس کو معلوم ہے) کہ آپ اللہ کے رسول ہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹ بول رہے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے خود منافقین کے ایمان بالرسالت کی نفی فرما دی۔ اس لیے کہ ان کا آپ ﷺ کی رسالت و نبوت پر وہ ایمان نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ خاص طور پر انہوں نے قتال کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ تو محمدؐ نے خود اپنی طرف سے شروع کر دیا ہے‘ ابھی قرآن میں تو قتال کا ذکر ہی نہیں آیا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں اتری جس میں قتال کا حکم ہو؟ یہ جو انہوں نے مکہ والوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے‘ یہ جو اُن کے قافلوں کا تعاقب کر رہے ہیں‘ ان کو سیاسی طور پر تنہا کرنے (political isolation) اور ان کی معاشی ناکہ بندی (Economic blockade) کے لیے انہوں نے جو اقدامات کیے ہیں ان کا اللہ کی کتاب سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی پر سورۂ محمد نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان کا یہ جو طرزِ عمل تھا اس کے بارے میں بھی فرما دیا گیا کہ یہ کفر ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵﴾ (النساء)

”پس نہیں (اے محمد ﷺ!) آپ کے ربّ کی قسم! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہوں گے جب تک کہ ہر اُس معاملے میں جو ان کے درمیان اُٹھے آپؐ کو آخری حکم تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ آپ کر دیں اس پر اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی محسوس نہ کریں‘ اور اس کو تسلیم کریں جیسے کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔“

اگر یہ معاملہ ہے کہ مان تو لیا ہے لیکن سینے کے اندر تنگی محسوس ہو رہی ہے‘ بات جبراً ماننی پڑ رہی ہے کہ کیا کریں‘ مسلمانوں میں اپنے آپ کو شامل تو کرانا ہی ہے‘ تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ بظاہر رسول اللہ ﷺ کے فیصلے اور قول کو تسلیم کرتے ہوئے بھی مؤمن نہیں ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں یہ اصولی بات فرما دی گئی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء:۶۴) ”اور ہم نے تو جو رسول بھی بھیجا ہے وہ اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

(۳) اکبر کا ''دینِ الٰہی'': اس تاریخی جائزے کو مختصر کرتے ہوئے اب میں اس دَور پر آ رہا ہوں جب کہ اُمّتِ محمد ﷺ کی عمر کا ایک ہزار سال گزر گیا' الفِ اوّل ختم ہوا اور الفِ ثانی شروع ہوا۔ اُس وقت یہ فتنہ ہندوستان میں بڑے شدّومد کے ساتھ ''دینِ الٰہی'' کی صورت میں اٹھا۔ مغل شہنشاہ اکبر کو اکبرِ اعظم اور مغلِ اعظم کہا جاتا ہے۔ اُس کے جاری کردہ ''دینِ الٰہی'' کو اکبر سے نسبت کی وجہ سے ''دینِ اکبری'' بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ''دینِ الٰہی'' کا مطلب یہ تھا کہ بس اللہ کو مانو' رسولوں کے ماننے سے تفرقہ ہوتا ہے' اس لیے کہ رسولوں کی شریعتیں جدا ہیں۔ خود قرآن کہتا ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸) ''(تم میں سے) ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا ہے''۔ ''دینِ الٰہی'' کی بنیاد میں فلسفہ یہ تھا کہ لوگوں میں جو فرق آتا ہے وہ رسالت کی وجہ سے آتا ہے' جبکہ خدا تو سب کا ایک ہے اور لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ پرمیشور کہہ لیں' مہادیو کہہ لیں' رام کہہ لیں' پرماتما کہہ لیں یا اللہ کہہ لیں' اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ وہ تو ایک ہی حقیقت ہے' بس اُس کو مانو' اُس کو پوجو' اُس سے محبّت کرو' اُس سے لو لگاؤ' اُس کا قرب حاصل کرو' باقی ان چیزوں کو چھوڑو' ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس فتنے کے پیچھے اکبر کی سیاسی حکمت عملی بھی تھی۔ اگرچہ وہ بالکل اَن پڑھ تھا لیکن ذہین بہت تھا۔ اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ یہی مذہبی فرق و تفاوت ہے اور اس کا حل یہی ہے کہ شریعت کا اور رسالت کا تصوّر بیچ میں سے نکال دیا جائے' خدا کو تو کسی نہ کسی صورت میں سب مانتے ہیں۔ اس سے ہندوستان کی تمام قوموں میں یکجہتی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ یہاں تک کہ اس کا جانشین شہزادہ سلیم (جہانگیر) بھی ایک ہندو رانی جودھا بائی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی کئی رانیاں تھیں۔ وہ تلک بھی لگا لیتا تھا اور بُتوں کی ڈنڈوت بھی کر لیتا تھا۔ ہر رانی کے ہاں بُت موجود تھے۔ کسی رانی کے ہاں جاتا تو وہاں موجود بُت کے آگے سر جھکا دیتا یا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ سارا فتنہ اس نے ایک سیاسی حکمت عملی کے تحت شروع کیا تھا' لیکن ہندوستان

میں اس فلسفہ کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

دوسری طرف یہاں کے تصوّف میں ہمہ اوست (Pantheism) اور وحدت الوجود (unity of existance) گڈمڈ ہو گئے۔ یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ ہیں اور ان میں باریک سا فرق ہے۔ عوام اس فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی سرائیکی علاقے کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر نے ''مسجد مندر ہکڑو نُور'' کا نعرہ بلند کیا۔ یعنی مسجد میں اور مندر میں ایک ہی نور ہے' خدا کو رام کہہ لو یا رحمان کہہ لو' کیا فرق پڑتا ہے! آپ کے شہر لاہور میں مادھو لال حسین کا مزار موجود ہے۔ ''مادھو لال'' ہندو نام ہے اور ''حسین'' کا اس کے ساتھ لاحقہ لگا دیا گیا ہے۔ تو اس قسم کے تصوّف اور اکبر کی حکمت عملی نے مل کر ایک بہت بڑا فتنہ اٹھا دیا کہ محمد ﷺ کی شریعت اور آپؐ کی رسالت کا دور ختم ہو گیا ہے' وہ ایک ہزار سال کے لیے تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن مجید میں دو جگہ یہ بات آئی ہے کہ اللہ کا ایک دن تمہارے حساب سے ایک ہزار سال کا بنتا ہے اور اللہ کا وہ ایک دن ختم ہو گیا' چنانچہ شریعتِ محمدیؐ اور نبوتِ محمدیؐ کا جو دور تھا وہ ختم ہوا' اب یہ ایک نیا دور ہے' اس میں دینِ الٰہی چلے گا جو اس دور کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

یہ فتنہ ہجری تقویم کے الف ثانی کے آغاز میں اٹھا تھا جب اُمّت کی عمر کا دوسرا ہزار سالہ دور شروع ہو رہا تھا۔ اس فتنے کا توڑ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو اٹھایا' جن کا نام ہی حضرت مجدّد الف ثانیؒ پڑ گیا۔ ان کے بارے میں علّامہ اقبال کہتے ہیں: ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

ہندوستان میں اُس وقت ملّت تو ختم ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ ملّت کی بنیاد آنحضور ﷺ کے اتباع اور اطاعت پر ہے۔ محض قرآن پر تو کوئی نظام سرے سے بنتا ہی نہیں۔ محض قرآن پر انحصار کر کے تو نماز کا نظام ہی نہیں بنتا' اور کیا نظام بنے گا؟ قرآن میں نماز کا تاکیدی حکم ہے اور نماز قائم کرو' نماز قائم کرو کی تکرار موجود ہے' لیکن پانچ نمازوں کا ذکر کہاں ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک نماز کی رکعتوں کا ذکر کہاں ہے؟ نظام اگر بنتا ہے تو سُنّت سے بنتا ہے' یہاں

تک کہ نماز کا نظام بھی سُنّت ہی سے بنتا ہے۔ ملّت وجود میں آتی ہے تو سُنّت کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است!

یعنی اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچا دو‘ اس لیے کہ دین تو نام ہی آپؐ کی پیروی کا ہے۔ اگر ان تک تمہاری رسائی نہ ہوئی تو سب بولہبی یعنی بے دینی ہے۔

(۴) ’’برہموسماج‘‘ کا فلسفہ: یہی فتنہ پھر انیسویں صدی میں ایک ہندو کے ذریعے سامنے آیا۔ راجہ رام موہن رائے عربی‘ فارسی اور اردو کا بہت بڑا عالم تھا‘ ہندی تو اس کی اپنی زبان تھی۔ ہندوستان میں ہندوؤں کا قومی سطح پر احیاء جن اشخاص کا مرہونِ منّت ہے ان میں راجہ رام موہن رائے بہت بڑے مقام پر ہے۔ یہ شخص ہندو ہونے کے باوجود موحّدِ کامل تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کا داخلہ اٹھارہویں صدی میں ہوا تھا اور جنگ پلاسی کے بعد سے بنگال پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ سیلاب آگے بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے کلکتہ میں پہلا پریس اور پہلا کالج قائم کیا اور بائبل کا اردو اور مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے اس کے نسخے لاکھوں کی تعداد میں پھیلا دیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمان اس فتنے کا زیادہ شکار نہیں ہوئے۔ اس کے اور بھی اسباب ہیں‘ لیکن اس کا ایک بہت بڑا ذریعہ راجہ رام موہن رائے بنا۔ اس نے ’’آئینۂ تثلیث‘‘ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں توحید کا اثبات اور تثلیث کا ابطال کیا۔ اس کتاب میں مسلمانوں کی طرف سے دفاع کیا گیا تھا۔ لیکن اس شخص کا نظریہ بھی یہی تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین موجود تفرقہ کو دور کرنے کی ایک ہی شکل ہے کہ ان کے اندر خدا کے نام پر اتحاد پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ’’برہموسماج‘‘ اور ’’مجلس ایزدی‘‘ کے نام سے ایک خاص مجلس قائم کی اور یہ اس کا ایک خاص فرقہ بن گیا۔ ’’دین الٰہی‘‘ کی طرح ’’برہموسماج‘‘ کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ بس ایک برہما (خدا) کو مان لو‘ تم اُسے اللہ کہہ لو‘ ہم اسے پرمیشور کہہ لیں‘ برہما کہہ لیں یا جو چاہیں کہہ لیں‘ لیکن دین کی باقی چیزیں جو ہیں ان کو ذرا پس پشت ڈال دو‘ ان کی اہمیت کم کر دو۔ راجہ رام موہن رائے کا انتقال ۱۸۳۳ء میں ہوا تھا۔

(۵) گاندھی کا تصوّرِ متحدہ قومیت: راجہ رام موہن رائے کے فلسفے کو بیسویں صدی میں گاندھی نے متحدہ قومیت کے تصور کے لیے تازہ کیا۔ گاندھی کی بھی ایک سیاسی بصیرت تھی کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں ہے جب تک کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو متحد نہ ہوں‘ اور ان کے اتحاد میں جو چیز حائل ہے وہ مسلمانوں کی شریعت‘ قانون اور تہذیب ہے۔ تو جب تک ہندوستان کے مذاہب کو ایک ہاون دستے میں ڈال کر کوٹ پیس کر ایک نہ بنا دیا جائے‘ تب تک ان مذاہب کے ماننے والے متحد نہیں ہو سکتے‘ اور جب تک یہ متحد نہیں ہوں گے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صبح ہی صبح گاندھی کی جو پرارتھنا ہوتی تھی اس میں گیتا بھی پڑھی جاتی تھی‘ قرآن کی تلاوت بھی ہوتی تھی اور گرو گرنتھ بھی پڑھ کر سنایا جاتا تھا‘ تاکہ معلوم ہو کہ یہ سب مذاہب ایک ہی ہیں۔ یہ فتنہ اس شدّ و مدّ کے ساتھ اٹھا تھا کہ ہندوستان کے علماء کی ایک بہت بڑی تعداد مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سرکردگی میں اس متحدہ قومیت کی قائل ہو گئی اور انہوں نے مان لیا کہ آج کل دنیا میں قومیں وطن کی بنیاد پر بنتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس فتنے کا شکار ہوئے۔ اس فتنے کا توڑ اُس شخص نے کیا جس کو حضرت مجدّد الف ثانیؒ سے خصوصی نسبت حاصل تھی‘ یعنی علّامہ اقبال۔ انہوں نے برملا کہا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں‘ مذہب ہے‘ اور مذہب نام ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت اور اتّباع کا۔ انہوں نے ’’وطنیت‘‘ کو دورِ حاضر کا سب سے بڑا بُت قرار دیتے ہوئے کہا: ؎

اِس دور میں مے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے‘ تو مصطفوی ہے
نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

وہی بات جو حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے کہی تھی وہی بات علامہ اقبال نے اپنے پیرایۂ بیان میں کہی۔ ان دونوں شخصیتوں کے مابین بڑی گہری باہمی نسبت ہے۔

(۶) فتنۂ انکارِ حدیث و حجیّتِ سُنّتِ رسولؐ: ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان پر انگریز کا پوری طرح تسلط ہو گیا تو یہاں فتنۂ انکارِ حدیث پیدا ہوا۔ ان لوگوں نے سُنّتِ رسولؐ کا استخفاف کیا۔ یہ فتنہ چونکہ مغرب سے درآمد شدہ فلسفہ و نظریات اور وہیں سے درآمد شدہ سائنس کے زیر اثر تھا لہٰذا یہ فتنہ پورے عالَمِ اسلام میں پھیل گیا' اگرچہ اس کے مرکز دو بنے' ایک ہندوستان اور دوسرے مصر۔ مصر ثقافتی اعتبار سے عالَمِ عرب کا امام ہے اور عجمی دنیائے اسلام میں سب سے بڑھ کر اہمیت ہندوستان کو حاصل تھی۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کی جو آبادی ہے اس کا تقریباً ایک تہائی ہندوستان میں تھا۔ آج (۲۰۰۶ء) بھی ایسا ہی ہے کہ پاکستان' بھارت اور بنگلہ دیش میں چالیس کروڑ سے زائد مسلمان ہیں' جبکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب پچیس کروڑ ہے۔ ہندوستان مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور علم و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں پر فتنۂ انکارِ حدیث کے سرخیل سرسیّد احمد خان تھے۔ ان کے بعد بہت سے علماء' خاص طور پر اہل حدیث علماء اس فتنے کا شکار ہوئے۔ مولانا عبداللہ چکڑالوی' چکوال کے قریب ایک گاؤں چکڑالہ کے رہنے والے' بہت بڑے اہلِ حدیث عالم تھے جو اس فتنۂ انکارِ حدیث میں مبتلا ہوئے اور پھر انہوں نے اسے بڑے پیمانے پر پھیلایا۔ یوپی کے مولانا اسلم جیراج پوری بھی مسلکاً اہل حدیث تھے' لیکن جب وہ اس فتنے کا شکار ہوئے تو انہوں نے اسے خوب بھڑکایا۔ اسی طرح مولانا تمنّا عمادی نے اس فتنے کو خوب ہوا دی۔ نیاز فتح پوری بہت عمدہ مضمون نگار اور انشا پرداز تھے' وہ بھی اس فتنے کا شکار ہوئے۔ غلام جیلانی برق بھی اس فتنہ کے آلۂ کار بنے رہے' اگرچہ آخر میں انہیں ہدایت نصیب ہو گئی۔

پاک و ہند میں سب سے بڑھ کر یہ فتنہ جس شخص سے پھیلا ہے وہ غلام احمد پرویز ہے۔ اس کا تحریر کا اسلوب بھی بڑا اچھا تھا' تقریر کا اسلوب بھی بہت دلکش تھا۔ ظاہر ہے کہ فتنہ وہی شخص برپا کر سکتا ہے جس میں صلاحیت ہوتی ہے' عام آدمی کیا فتنہ برپا کرے گا؟ اور اگر

کرے گا تو اسے پھیلائے گا کیسے؟ تحریر و تقریر کے ذریعے سے فتنہ پھیلتا ہے' پروان چڑھتا ہے' اور ان دونوں چیزوں پر اس شخص کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ دیکھئے' پنجاب نے دو غلام احمد پیدا کیے ہیں۔ ایک غلام احمد قادیانی' جس نے ختم نبوت کی مہر توڑ دی اور اجرائے وحی و نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ دوسرا غلام احمد پرویز' جس نے اس اعتبار سے نبوت و رسالت کو زخم لگائے کہ ٹھیک ہے' نبی کی رسالت کو ہم مانتے ہیں' لیکن نبی کی اطاعت اور ان کے اتباع کا معاملہ صرف ان کی زندگی تک تھا۔ پرویزیت کا یہ فتنہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس کے دروس اور تقاریر کے کیسٹ آج بھی پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ اس کا رسالہ ''طلوعِ اسلام'' آج بھی شائع ہوتا ہے۔ ''بزمِ طلوعِ اسلام'' کے نام سے نہ صرف پاکستان کے مختلف حصّوں اور علاقوں میں بلکہ دیگر ممالک کے اندر بھی چھوٹے چھوٹے حلقے قائم ہیں' جہاں پر لوگ جمع ہو کر اس کے دروس اور تقاریر کے کیسٹ سنتے ہیں۔

فتنۂ پرویزیت کیا تھا' اس کے خدوخال کیا تھے' اس کا میں ایک اجمالی تجزیہ پیش کرتا ہوں۔ انگریزی محاورے ''Give the Devil his due.'' کے مصداق یہ ماننا پڑتا ہے کہ پرویز نے کبھی حدیث کا مطلقاً انکار نہیں کیا' بلکہ اُس کا موقف یہ تھا کہ دائمی ہدایت اور دائمی قانون صرف قرآن کا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا حکم آیا ہے وہاں رسولؐ کی شخصیت مراد نہیں ہے بلکہ رسولؐ کے ''مرکزِ ملّت'' ہونے کی حیثیت مراد ہے۔ اُس وقت چونکہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے امیر بھی تھے' پھر آپؐ مدینہ میں سربراہِ مملکت بھی بن گئے تھے' اس اعتبار سے آپؐ مرکزِ ملّت تھے' لہٰذا آپؐ کی اطاعت مسلمانوں کے امیر اور مرکزِ ملّت کی حیثیت سے تھی۔ اب جب بھی کوئی اسلامی ریاست قائم ہو گی تو جو کوئی مرکزِ ملّت ہو گا اس کی اطاعت ہو گی۔ اُسے حق حاصل ہو گا کہ وہ شریعتِ محمدیؐ کا جو حکم چاہے تسلیم کرے اور جو حکم چاہے تسلیم نہ کرے۔ اس طرح پرویز نے رسالتِ محمدیؐ' نبوتِ محمدیؐ' شریعتِ محمدیؐ اور سُنّتِ محمدیؐ کی گویا عملاً نفی کر دی۔ اس کا موقف تھا کہ ہم صرف انہی احادیث کو مانیں گے جو قرآن کے مطابق ہوں۔ اس طرح گویا قرآنی احکام کی من مانی تعبیرات کرنے کا راستہ نکالا گیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی تشریح و تفسیر اور تعبیر اگر سُنّت سے

آزاد ہو کر کی جائے تو قرآن کو موم کی ناک بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔

قرآن مجید میں چور کے بارے میں حکم آیا ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا﴾ (المائدۃ:۳۸) ''چور خواہ مرد ہو یا عورت ہو اُن کے ہاتھ کاٹ دو''۔ اس حکم کی رسول اللہ ﷺ نے کیا تعبیر فرمائی تھی؟ یہی کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ چنانچہ آپؐ نے بالفعل چوروں کے ہاتھ کاٹے۔ بنومخزوم کے ایک بڑے اونچے گھرانے کی خاتون فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی۔ اسے پیش کیا گیا تو الزام ثابت ہو جانے پر آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ اس پر اس قبیلے کے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ اور تو کسی کو لب کشائی کی ہمت نہیں تھی' حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے چہیتے تھے' ان کے ذریعے سفارش کرائی گئی کہ حضور! یہ اونچے خاندان کی عورت ہے' اس کے خاندان کی ناک کٹ جائے گی' آپ اس کے معاملے میں ذرا نرمی کیجیے۔ اس پر آنحضور ﷺ نے سخت غصے اور ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا: ((اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟'' پھر آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور پھر فرمایا:

((اِنَّمَا اَهْلَکَ الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ اَنَّهُمْ کَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِیْهِمُ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْهُ وَاِذَا سَرَقَ فِیْهِمُ الضَّعِیْفُ اَقَامُوْا عَلَیْهِ الْحَدَّ' وَاَیْمُ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَهَا))[1]

''تم سے پہلی اُمتیں اسی لیے تو تباہ و برباد ہوئی تھیں کہ جب ان میں سے کوئی معزّز شخص چوری کرتا تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور شخص چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اللہ کی قسم' اگر (بالفرض) فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو مَیں اُس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

احادیث میں صراحت موجود ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُس عورت کا ہاتھ قطع کروا دیا۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب حدیث الغار۔ وصحیح مسلم' کتاب الحدود' باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنھی عن الشفاعۃ فی الحدود۔

لیکن اس قرآنی حکم کی تعبیر پرویز صاحب یہ کرتے ہیں کہ ''چور کا ہاتھ کاٹ دو'' کا مطلب یہ ہے کہ ایسا فلاحی معاشرہ قائم کر دو' ایسا معاشی نظام بنا دو کہ کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ رہے۔ جیسے والدین کسی مسئلے میں اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ بھئی تم نے تو ہمارے ہاتھ کاٹ دیے' یعنی تم نے تو ایسا قدم اٹھا لیا کہ اب ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ گویا محض ایک محاورہ ہے' بالفعل ہاتھ کاٹ دینا مراد نہیں ہے' یہ مفہوم تو مولویوں نے خواہ مخواہ نکال لیا ہے۔ حالانکہ ڈھٹائی کا یہ عالَم ہے کہ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے: ﴿جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ درحقیقت ان کے کرتوتوں کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت انگیز سزا''۔ تو کیا ان کے کرتوتوں کا بدلہ یہ ہے کہ ایک فلاحی نظام قائم کرو؟ اور کیا اس اعلیٰ نظام سے عبرت پیدا ہو گی؟ قرآن مجید اپنی حفاظت خود کرتا ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۲) ''باطل نہ تو اس (قرآن) کے آگے سے اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔''

بہرحال یہ ان کا موقف تھا اور یہ موقف ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ ان کے ہاں درسِ قرآن کے نام سے جو محفل ہوتی تھی وہ مخلوط محفل ہوتی تھی' اس میں مرد' خواتین اور نوجوان لڑکیاں بے پردگی کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔

(۷) دورِ حاضر کے دجّال کا حربہ: اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہ فتنہ بڑے شدّ و مدّ کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر اُٹھ رہا ہے اور اسے دجاجلہ میں سے ایک بہت بڑے دجال امریکہ اور شخصی طور پر بش کی پشت پناہی اور تائید حاصل ہے۔ اس فتنے کا ہدف کیا ہے؟ اسلامی تہذیب کی بیخ کنی کرنا! اور اس کا حربہ کیا ہے؟ تفریق بین اللہ والرسل! یعنی اللہ کو مانو' قرآن کو مانو اور اس کی من مانی تعبیر کرو اور رسولوں کو چھوڑو' رسول کی بات کو چھوڑو۔ وہ تو بس اپنے وقت کے لیے آئے تھے اور انہوں نے ایک وقتی کلچر اور وقتی نظام پیدا کر دیا تھا' جو لوگوں کی اُس وقت کی ذہنی سطح اور اُس وقت کے ماحول کے مطابق تھا۔ یہ کوئی دائمی اور مستقل شے نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب کی بیخ کنی کا تاریخی پس منظر

اِس وقت دنیا میں شیطانِ لعین کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود کے ذریعے سے دجّالیت جو مرحلہ وار آگے بڑھی ہے‘ اس موضوع پر میں ’’موجودہ عالمی حالات میں اسلام کا مستقبل‘‘ کے عنوان سے تقریر کر چکا ہوں۔

(۱) شیطانِ لعین اور اس کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود کے زیر اثر دنیا پر دجّالیت کا پہلا وار سیکولرزم کے عنوان سے ہوا۔ یہ ریاست اور سیاست کے میدان میں بڑا کاری وار تھا۔ یعنی مذہب کو‘ خدا کو‘ خدائی احکام کو‘ آسمانی ہدایت کو ریاست سے الگ کر دو۔ ریاست کا نظام اور اس کا قانون بنانا انسانوں کا کام ہے۔ عوام خود حاکم ہیں‘ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے سے جو چاہیں گے قانون بنائیں گے۔ خدا کو مساجد اور دوسری عبادت گاہوں تک محدود رکھو‘ وہ ہمارے ایوانِ حکومت میں نہیں آئے گا‘ ہمارے قانون ساز ادارے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ حاکمیّت اُس کی نہیں ہے‘ حاکمیّت عوام کی ہے۔ یہ دجّالیت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا وار تھا۔ چونکہ سب سے پہلی چیز ہی سب سے اہم ہوتی ہے‘ لہٰذا یہ وار بڑا کاری ثابت ہوا اور اب یہ بات پوری دنیا میں تسلیم کر لی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں خدا کے خلاف اس سے بڑی بغاوت آج تک نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے دنیا میں شرک ہوتا تھا کہ ایک بڑے خدا (God) کو ماننے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے خدا (gods) بھی مان لیے جاتے‘ لیکن خدا کو اس طرح انسانی معاملات‘ خاص طور پر ریاست‘ سیاست‘ حکومت اور قانون سازی کے اختیارات سے بے دخل کر دینے کا معاملہ اِسی دَور میں ہوا ہے۔

(۲) دجّالیت کا دوسرا وار معیشت کی سطح پر ہوا اور معیشت کی بنیاد سود پر مبنی سرمایہ داریت (Interest based capitalism) پر رکھ دی گئی۔ جبکہ آسمانی شریعتوں کے نزدیک اعمال میں سب سے بڑا گناہ سود ہے۔ عقائد میں شرک کو ناقابل معافی گناہ قرار دیا گیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ (النّساء: ۴۸ و ۱۱۶) ’’یقیناً اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے‘ البتہ اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے

گا‘‘۔ اور اعمال میں سود وہ گناہ ہے جسے ترک نہ کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ دجّالیت کے زیر اثر وہی سود معیشت کی مرکزی شے بن گیا اور یہ معاملہ بھی اب گلوبل ہو چکا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک میں سودی معیشت جڑ پکڑنے کے بعد برگ و بار لا رہی ہے۔

(۳) دجّالیت کا تیسرا وار کافی بڑے پیمانے پر سماجی و معاشرتی سطح پر ہو رہا ہے۔ مغرب اور اس کے زیر اثر دوسرے ممالک کے اندر تو یہ وار سو فیصد کامیاب رہا ہے‘ لیکن ابھی عالَمِ اسلام میں پورے طور سے کارگر نہیں رہا۔ چنانچہ اس کے لیے ایک منظّم سازش کے ساتھ بڑی جِدّوجُہد ہو رہی ہے۔ یہ وار ہے شرم و حیا‘ عفت و عصمت کے تصوّرات اور ستر و حجاب کے قوانین اور ضابطوں سے آزاد تہذیب اور معاشرت کا فروغ۔ اسلامی تہذیب کو اِس وقت سب سے بڑا چیلنج اسی سے ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی تہذیب کا بنیادی اور اہم ترین نکتہ ہے۔ اس کے لیے امریکہ میں ان کے تھنک ٹینکس قائم ہیں‘ جن میں بہت بڑے مفکّر اور دانشور سوچ بچار کرتے ہیں اور اس سوچ بچار کا نتیجہ اپنے مقالات اور کتابوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں‘ جو ایک طرح سے حکومت کی راہنمائی ہوتی ہے۔ چنانچہ سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے ایک کتاب لکھی: ’’تہذیبوں کا ٹکراؤ‘‘ (Clash of Civilizations)‘ جس میں اس نے واضح کیا کہ اب ہماری تہذیب کا مسلم تہذیب سے فیصلہ کن ٹکراؤ ہونا ہے۔ اس کتاب میں اس نے تجزیہ کیا ہے کہ ٹائن بی کے مطابق دنیا میں آج تک کل بیس تہذیبیں قائم ہوئی ہیں‘ ان میں سے بارہ تو مر چکی ہیں‘ نسیاً منسیاً ہو چکی ہیں اور آٹھ ابھی باقی ہیں۔ ایک ہماری مغربی تہذیب ہے‘ سات اور ہیں‘ ان سات میں سے بھی پانچ ایسی ہیں جنہیں ہم آسانی کے ساتھ اپنے اندر جذب (assimilate) کر سکتے ہیں — جیسے انڈین تہذیب بڑی آسانی سے مغربی تہذیب میں جذب ہو گئی‘ اس لیے کہ ان کی تہذیب و ثقافت پہلے ہی مغرب سے قریب تر تھی‘ وہی بے پردگی اور عریانی پہلے بھی تھی‘ اب اور بڑھ گئی‘ وہی ناچ گانا پہلے بھی تھا‘ اب اور زیادہ ہو گیا‘ لہٰذا تہذیبی ٹکراؤ تو وہاں ہے ہی نہیں — لیکن دو تہذیبیں ایسی ہیں جو ہمارے لیے چیلنج ہیں۔ وہ گویا لوہے کے چنے ہیں

جنہیں چبانے میں وقت لگے گا۔ان میں سے ایک مسلم تہذیب ہے اور دوسری چین کی کنفیوشین (Confucian) تہذیب۔مؤخرالذکر کے بارے میں تو مَیں اُس وقت نہیں سمجھا تھا کہ آیا چین کے اندر یا اس کے آس پاس کے ممالک میں جو بدھ مت کے پیروکار شمار ہوتے ہیں' واقعی ان کی کوئی تہذیب کنفیوشس کے حوالے سے موجود ہے؟ ابھی حال ہی میں نیوز ویک کا ایک پرچہ چھپا ہے' جس کا مرکزی مضمون تھا ''کنفیوشس کا احیاء'' (Revival of Confucius) یعنی چین میں اِس وقت کنفیوشس کے نظریات کا احیاء ہو رہا ہے۔لہٰذا اُس نے اسے بھی اپنے لیے خطرہ قرار دیا ہے' لیکن انہیں اصل خطرہ مسلم تہذیب سے ہے اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا چیلنج تصور کرتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کی تاریخ

اب ذرا اسلامی تہذیب کا ایک تاریخی جائزہ لے لیجیے' جو شرم وحیا' عفت وعصمت اور ستر وحجاب کے احکام پر مبنی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حدیث مَیں نے شروع میں آپ کو سنائی ہے: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ غَرِیْبًا' فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) یعنی اسلام کا آغاز جب ہوا تو وہ بہت اجنبی اور نامانوس سا تھا۔لوگوں کے لیے اس کی تعلیمات نئی باتیں تھیں' لہٰذا لوگ انہیں سمجھتے نہیں تھے۔ پھر اس کے بعد اسلام کے غلبے کا دور آ گیا۔ جو غالب ہو جائے اس کے تو سبھی دوست بن جاتے ہیں' لہٰذا بہت سے لوگ اس کا علم لے کر کھڑے ہو گئے' لیکن عنقریب اسلام پھر سے غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔تو جو لوگ اسلام کی اجنبیت میں اس کا ساتھ دیں اور خود بھی اجنبی ہو جائیں ان کے لیے مبارک باد اور تہنیت ہے۔ یہ مبارک باد اور تہنیت ان کے لیے ہے جو زمانے کا ساتھ نہ دیں' اسلام کا ساتھ دیں' چاہے کہا جائے کہ یہ بڑے بنیاد پرست (Fundamentalists) ہیں' یہ بڑے کٹھ ملّا ہیں' یہ بڑے دقیانوسی ہیں' یہ بڑے تنگ نظر اور بڑے رجعت پسند ہیں۔انہیں جو بھی کہا جائے' لیکن یہ اسلام کے ساتھ چمٹے رہیں!

اب اس کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پر اجنبیت کا پہلا پردہ یا پہلا سایہ خلافت راشدہ کے فوراً بعد ہی پڑ گیا جب حکومت اور ریاست کے میدان میں

﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ﴾ کا معاملہ ختم ہوا اور ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔ بنواُمیہ' بنوعباس اور اس کے بعد جو بادشاہتیں بنیں' خواہ وہ مغلوں کی حکومت تھی' صفویوں کی حکومت تھی یا ترکوں کی حکومت تھی' وہاں پر خلافت کے بنیادی تصوّر کی نفی تھی۔ خلافت کا یہ تصوّر کہ اپنے میں سے بہترین کا انتخاب کرو اور پھر ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا﴾ (النساء:۵۸) کے مصداق ان کی ذمہ داریاں ان کے حوالے کر دو' اس کو ختم کر دیا گیا اور اب جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول رائج ہو گیا۔خلافت راشدہ کے بعد بنواُمیہ نے اپنی عصبیت اور طاقت کی بنیاد پر حکومت قائم کر لی۔ یہ اسلام پر اجنبیت کا پہلا پردہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ملوکیت نے خوب پنجے گاڑ دیے اور ملوکیت شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی۔ بنوعباس کے دَور میں اسلام پر اجنبیت کا دوسرا پردہ معیشت کے میدان میں پڑا۔ اس دور میں ایک طرف جاگیرداری نظام قائم ہوا جو ملوکیت کی بنیاد ہوتی ہے۔آپ کو مشرق ومغرب میں ہر جگہ شہنشاہیت اور بادشاہت کے زیر سایہ جاگیرداری نظام ملے گا۔ ہر بادشاہ کے تیس ہزاری اور بیس ہزاری منصب دار ہوتے تھے اور اسی نظام کے بل پر حکومت قائم ہوتی تھی۔ اور اس نظام کے لیے مزارعت ضروری ہے۔آپ نے کسی کو بہت بڑی جاگیر دے دی ہے تو کیا وہ شخص اسے خود کاشت کر لے گا؟ ظاہر ہے وہ اسے کسی کو بٹائی پر کاشت کے لیے دے گا۔ یہ زمین کا سود ہے جو سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوا۔ اس کو حرامِ مطلق قرار دیتے ہیں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی' جو اصحاب الرائے کے سرخیل ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی جو اصحاب الحدیث کے سرخیل ہیں۔ اور پھر بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے عنوان سے نقد کے معاملے میں بھی سود کی ہلکی سی شکل اسلام میں داخل ہو گئی۔

ملوکیت اور شہنشاہیت کے اَدوار میں سیاسی وریاستی سطح پر پسپائی اور اسلام کی معاشی تعلیمات میں ترامیم کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت قائم رہی اور ان کا طرز بود وباش' ان کا عائلی نظام' خاندانی نظام اور ان کے عائلی قوانین مشرق سے مغرب تک جوں کے توں قائم ودائم رہے' خواہ وہ بنواُمیہ کا دورِ ملوکیت تھا یا بنوعباس کا' یا دوسرے بادشاہوں کے ادوار تھے' یا مغربی استعمار کا دور تھا۔ مسلمانوں کا اپنا کلچر وجود میں آیا' مسلم طرزِ تعمیر

وجود میں آیا' جو دنیا میں مورِش طرزِ تعمیر (Moorish Architecture) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا آغاز سپین کے اندر مکان بنانے کے ایک خاص انداز سے ہوا کہ زنان خانہ علیحدہ ہے' مردانہ علیحدہ ہے' پہلے مردانہ ہے' پھر اس کے بعد ڈیوڑھی آئے گی اور زنانہ شروع ہوگا۔ باہر سے جو آئے گا وہ یہاں مردانے میں قیام کرے گا' زنان خانہ کے اندر صرف محرم جائیں گے' اور کوئی نہیں جا سکتا۔ اس طرزِ تعمیر کی بنیاد اسلام کی معاشرتی وسماجی تعلیمات تھیں۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد پر مسلمانوں کا آرٹ وجود میں آیا۔ مسلمانوں کی خطّاطی اور مظاہرِ فطرت کی نقّاشی دنیا میں بہت بڑا آرٹ بن گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت' عائلی نظام اور معاشرتی اقدار میں فرق نہیں آیا' چاہے سیاسی اور معاشی اعتبار سے دجّالیت مختلف ادوار سے گزر کر اسلام کے رُخِ روشن پر پردے ڈالتی رہی۔

دجّالیت کا آخری حملہ

ہماری اس تہذیب پر ہونے والے دجّالیت کے اس آخری حملے کا ہدف یہ ہے کہ چادر اور چار دیواری کا جو حصار (قلعہ) اب تک قائم ہے اس کو منہدم کر دیا جائے' بے پردگی' عریانی وفحاشی اور مخلوط معاشرت کو عام کر دیا جائے' آزاد شہوت رانی کو فروغ دیا جائے' جس کے نتیجے میں شادی کے مقدّس بندھن کی حیثیت ختم ہو جائے اور خاندان کا ادارہ تباہ ہو جائے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' مغرب میں اب شادی بیاہ تقریباً مفقود ہونے والی بات ہے۔ وہاں کے جوڑے ایک دوسرے کو میاں بیوی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ساتھ رہ رہے ہیں' لیکن ہم شادی شدہ نہیں ہیں۔ اسی طرح ان کے ہاں اولاد ہو رہی ہے۔ بش نے کئی دفعہ وعظ کیا ہے کہ شادی کرو اور میاں بیوی کی حیثیت سے رہو۔ اس لیے کہ وہاں کوئی شادی کرتا ہی نہیں۔ ان کے عائلی قوانین ایسے غیر فطری ہیں کہ کوئی مرد اس کو گوارا نہیں کرتا کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھے اور قانونی طور پر ان قوانین کی زد میں آ جائے۔ شادی کے بغیر ساتھ رہنے والے مرد وعورت میں اگر علیحدگی ہو جاتی ہے تو مرد پر کوئی قانونی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس طرح وہاں پر خاندانی نظام کی بیخ کنی ہو چکی ہے۔

دجّالیت نے اپنا یہ ہدف دنیا کے بہت بڑے حصے میں پورے طور پر حاصل کر لیا ہے'

لیکن ابھی عالَمِ اسلام میں اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ مسلم معاشروں میں ابھی کچھ نہ کچھ خاندانی قدریں موجود ہیں' کچھ بزرگوں کا احترام ہے' شادی کے بندھن کی کچھ اہمیت ہے' اس کا کچھ تقدّس ہے' شرم وحیا کی کوئی قدر و قیمت ہے' عصمت وعفت کے اعلیٰ قدر ہونے کا کوئی تصوّر ہے' ستر وحجاب کا کوئی تصوّر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ان تہذیبی اقدار کی جڑ کاٹنے کے لیے عالمی سطح پر منصوبہ سازیاں جاری ہیں۔ ذرا یاد کیجیے' عورتوں کی آزادی (Women Lib) کے لیے سب سے پہلے عالمی سطح پر قاہرہ کانفرنس ہوئی' پھر بیجنگ کانفرنس ہوئی' پھر تنظیم اقوام متحدہ (U.N.O) کے زیر اہتمام بیجنگ پلس فائیو کانفرنس ہوئی اور اس میں جو سفارشات منظور ہوئیں وہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مثلاً ہم جنسیت (homosexuality) کو کوئی عیب نہ سمجھا جائے' یہ بھی انسان کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ مرد مرد سے اور عورت عورت سے شہوت رانی کرے تو کوئی حرج نہیں' یہاں تک کہ مرد سے مرد کی شادی اور عورت سے عورت کی شادی روا ہے۔ اسی طرح جسم فروش عورتوں کے لیے prostitute جیسا گھٹیا لفظ استعمال نہ کیا جائے' بلکہ ان کے پیشے کا احترام کرتے ہوئے انہیں ''سیکس ورکر'' کا نام دیا جائے۔ وہ بھی تو آخر محنت کش ہیں' جنس کی بنیاد پر محنت کرنے والیاں ہیں۔ ایک مزدور اپنی جسمانی محنت اور طاقت استعمال کر کے پیسہ کماتا ہے۔ ایک عورت بھی اگر اپنے جسم کے ایک حصے کو استعمال کر کے پیسے کما رہی ہے تو اسے کیوں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو؟ پھر مرد اور عورت ہر اعتبار سے برابر ہیں اور زندگی کے تمام معاملات میں شانہ بشانہ شریک ہوں گے۔ وراثت میں بھی عورت کا برابر کا حصّہ ہوگا۔ یہ کیا کہ عورت کا حصّہ مرد سے آدھا اور عورت کی گواہی مرد سے آدھی؟ بلکہ مرد اور عورت ہر حیثیت سے برابر ہیں۔ عورت شادی کر کے تمہارے گھر میں آباد ہو جاتی ہے تو اگر وہ گھر کا کام کاج کرے گی تو اسے آپ سے اس کی اجرت لینے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح اگر وہ حمل اور وضع حمل کی تکالیف جھیلتی ہے تو اس پر بھی شوہر سے اجرت لے سکتی ہے۔ پھر یہ کہ اگر شوہر بیوی سے ہم بستری کے لیے اصرار کرے لیکن عورت انکار کر دے تو شوہر کے اقدام کو زنا بالجبر (rape) قرار دیا جائے گا اور اس بنیاد پر اس کے خلاف مقدّمہ چلایا جائے گا۔

اسے ''marital rape'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی سفارشات ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ شریعت کا دارومدار یا اساس یا بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ (۱) اللہ کی کتاب قرآن اور (۲) اللہ کے رسول ﷺ کی سُنّت۔ ان کے علاوہ دو اضافی چیزیں اجماع اور قیاس (اجتہاد) ہیں' لیکن بنیادی چیزیں دو ہی ہیں: قرآن اور سُنّتِ رسولؐ۔ خاص طور پر تہذیب وتمدن کے معاملے میں سُنّتِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ کی محبّت اور آپؐ کی تعظیم وتوقیر سب سے اہم ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا رسولؐ ہمیشہ کے لیے مرکزِ ملّت ہے۔ آپ ﷺ کی تعظیم میں کمی ہوگی تو دین کی جڑ ختم ہو جائے گی' تہذیب اسلامی ختم ہو جائے گی۔ آپ ﷺ کی صرف اطاعت ہی نہیں' اتباع درکار ہے۔ آپ ﷺ کا اتباع اگر نہیں ہوگا تو تہذیبِ اسلامی کا وجود نہیں رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر اور آپؐ کے ادب واحترام کا مضمون میں نے سورۃ الحجرات کے دروس میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پورے عالَمِ اسلام کے لیے اصل مرکزی شخصیت اور اصل مرکزی قیادت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے اور آپؐ کی یہ حیثیت دائمی ہے۔ آپ ﷺ کی محبّت اور آپؐ کی توقیر وتعظیم نہ صرف ایمان کا جزو لازم ہے بلکہ یہ وحدتِ اسلامی کی روح ہے۔ بقول اقبال: ؎

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ است

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے محض سوئے ادب سے تمام اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔ سورۃ الحجرات میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر نبی مکرم ﷺ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرو گے تو تمہارے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ میں تفصیل سے عرض کرتا رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران اس حکم کا مطلب آنحضور ﷺ کی آواز سے اونچی آواز کر کے بات کرنا تھا' لیکن اب اس کا مصداق آنحضور ﷺ کی بات کے مقابلے میں اپنی بات لانا ہے۔ یعنی کوئی شخص یہ کہے کہ ٹھیک

ہے' حدیث میں تو یہ آیا ہے لیکن میری رائے یہ ہے۔ تُف ہے اس طرزِ عمل پر! اگر تم نے مان لیا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو اپنی رائے پیش کرنے والے؟ اس طرح تو تمہارے تمام اعمالِ صالحہ ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم اس زعم میں رہو گے کہ میں نے کوئی گناہ کبیرہ تو نہیں کیا۔ نہ کبھی زنا کیا ہے' نہ شراب پی ہے۔ تمہیں شعور بھی نہیں ہوگا' اور تمہاری اب تک کی ساری کارگزاری اکارت چلی جائے گی۔

دجّالیت کے دو محاذ

اہلِ مغرب کی طرف سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو مجروح کرنے کا کام اگرچہ پہلے بھی ہوا ہے' لیکن یہ بڑے مصنّفین کی کتابوں میں' بڑے محدود پیمانے پر ہوا ہے۔ لیکن اب انتہائی شدّومدّ کے ساتھ دو محاذوں سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ ایک تو ''توہینِ رسالت'' کا محاذ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ بہت بڑے پیمانے پر آنحضور ﷺ کے کارٹون بنا کر شائع کیے گئے ہیں۔ اس پر انہوں نے عالَمِ اسلام کا ردِّعمل دیکھ لیا ہے کہ کچھ جلوس نکل آئے' کوئی توڑ پھوڑ ہوگئی۔ اس طرح ہم نے جو بگاڑا اپنا ہی بگاڑا' ان کا کیا بگاڑا؟ اس اعتبار سے غور طلب بات یہ ہے کہ انہوں نے ایک کاری وار کر کے اس کا ردِّعمل دیکھ لیا ہے کہ بس تھوڑے سے دقیانوسی اور جذباتی لوگ ہیں جو اس پر احتجاج کر رہے ہیں اور وہ بھی عام طور پر اَن پڑھ ہیں' یا مولوی ملاّ ٹے ہیں۔ عالَمِ اسلام کی کسی حکومت نے کوئی قدم اٹھایا؟ کوئی احتجاج کیا؟ ہماری اس بے حسی پر وہ اور جری ہو گئے اور یہ کارٹون یورپ کے کتنے ہی اخبارات میں شائع کر دیے گئے۔ اور اس پر کسی طرف سے کوئی معذرت نہیں کی گئی۔

اس حملے کا دوسرا محاذ یہ ہے کہ حدیث کا استخفاف کرو اور سُنّتِ رسول کی حُجّیت کو ختم کر دو۔ یعنی وہی ''تفریق بین اللہ والرسل والاحربہ''۔ اس حملے کی پشت پر پورا عالَمِ مغرب ہے' یہودی بھی' عیسائی بھی اور سب سے بڑھ کر عالمی میڈیا۔ اس سے بھی بڑھ کر سول سپریم پاور آن ارتھ دی یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ اس کی پشت پر ہے۔ لہٰذا اسلامی ممالک میں این جی اوز پر اربہا ارب ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں اور ان این جی اوز کا کام ہے مسلم تہذیب کی بیخ کنی۔ ہنٹنگٹن نے مسلم تہذیب کو لوہے کا چنا قرار دیا ہے اور ان کے

نزدیک اس کو چبانے کے لیے لوہے کے دانت ہی درکار ہیں‘ اس لیے کہ لوہے کو تو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے (اِنَّ الحدیدَ بالحدیدِ یُفلَحُ)۔ چنانچہ مسلم تہذیب کی بربادی کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی جارہی ہیں۔ ہمارے آنکھوں دیکھتے زبیدہ جلال آسمانِ امریکہ سے ٹپک پڑیں اور ہمارے نظامِ تعلیم کے اندر بنیادی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ امتحانات اور نصاب وغیرہ کا معاملہ آغا خان فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ سب کیا ہے؟ عالمِ اسلام میں جو امریکہ کے پٹھو (poodles) حکمران بیٹھے ہوئے ہیں‘ جن میں سب سے بڑا پرویز مشرف ہے‘ یہ روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے نام سے امریکی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں۔ چنانچہ ایوانِ صدر سے لے کر حکومت کی مختلف سطحوں تک اسی روشن خیالی کا پرچار ہو رہا ہے‘ اور سب سے بڑھ کر اب میڈیا کے ذریعے اسی کا پرچار ہو رہا ہے اور میڈیا کی جو رسائی ہے اس کا آپ اندازہ کیجیے۔

’’رینڈ کارپوریشن‘‘ کی سفارشات

اس کے ضمن میں خاص طور پر میں ’’رینڈ (RAND) کارپوریشن‘‘ کی سفارشات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کچھ ہی عرصہ قبل آئی ہیں۔ رینڈ کارپوریشن امریکہ کا سب سے چوٹی کا تھنک ٹینک ہے۔ اس نے تجزیہ کر کے اپنی حکومت کو بتایا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک جیسے نہیں ہیں‘ بلکہ مسلمان چار طرح کے ہیں:

(۱) بنیاد پرست (Fundamentalists) جو اسلام کو صرف ایک مذہب نہیں سمجھتے‘ بلکہ ایک سیاسی‘ معاشی اور سماجی نظام سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ ان کے خلاف ہمارا اعلانِ جنگ ہے اور انہیں ہم نے ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔

(۲) روایت پسند (Traditionalists) جن میں بڑی تعداد علماء کی ہے۔ ان کے مدرسے ہیں جہاں یہ قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم میں مشغول ہیں‘ انہیں نظام وغیرہ سے کوئی بحث نہیں۔ یہ لوگ فی نفسہٖ تو خطرناک نہیں ہیں‘ لیکن اگر کہیں یہ فنڈامنٹلسٹس سے مل جائیں تو بہت خطرناک ہیں۔ اس لیے کہ انہیں اجتماعاتِ جمعہ کی صورت میں بہت بڑا exposure حاصل ہوتا ہے۔ کوئی سیاسی جماعت اگر چھوٹا سا جلسہ بھی کرے گی تو اس کے لیے پوسٹر

شائع کرے گی‘ اخبارات میں اشتہار دے گی اور اس کے انتظامات کے لیے کتنے کھکھیڑ مول لے گی‘ لیکن یہاں سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے۔ مساجد میں علماء کو ہر جمعہ کے روز ایک پبلک میٹنگ مل جاتی ہے‘ جس میں شرکت کے لیے اکثر مسلمان نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر‘ خوشبو لگا کر کچے دھاگے سے بندھے کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ روایت پسند علماء بنیاد پرستوں کے ساتھ مل جائیں تو بہت خطرناک ہیں۔ پھر انہوں نے مشورہ بھی دیا ہے کہ ان کو ان کے باہمی مسلکی اور مذہبی اختلافات میں الجھائے رکھو اور ان اختلافات کو خوب بھڑکاؤ‘ تاکہ یہ لوگ اِدھر اُدھر نہ دیکھ سکیں۔

(۳) جدیدیت پسند (Modernists) یعنی ایسے دانشور جو اسلام اور اسلامی تہذیب کی ایسی تعبیر کر رہے ہیں جو ہماری تہذیب کے ساتھ موافق (compatible) ہے اور وہ ہماری تہذیب کے لیے کوئی چیلنج نہیں رکھتی۔ ایسے جدیدیت پسند اور تجدد پسند دانشوروں کی مدد کی جائے اور خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا میں ان کو نمایاں کیا جائے۔ اس لیے کہ ظاہر بات ہے مسجد میں تو کوئی ان کی بات نہیں سنے گا‘ کوئی ان کو منبر پر کھڑا ہونے نہیں دے گا۔ لہٰذا ہمارے پاس اس سے کہیں زیادہ وسیع ذریعہ جو موجود ہے یعنی الیکٹرک میڈیا‘ اس پر انہیں ایکسپوژر دیا جائے۔

(۴) سیکولر: مسلمانوں میں بھی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خالص سیکولر ہو چکے ہیں۔ وہ تو ہیں ہی ہمارے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز روزہ تو بس انفرادی مسئلہ ہے‘ کوئی کرے نہ کرے‘ اس کا ریاست وحکومت سے‘ دستور وقانون سے اور تہذیب وتمدن سے کوئی واسطہ نہیں۔

دجّالیت کے تازہ حملے کے چند مظاہر

اسلام پر دجّالیت کے تازہ حملے کے ہمارے ہاں جو مظاہر نظر آ رہے ہیں اس کی مثالیں تو بے شمار ہو سکتی ہیں‘ لیکن بطور مشتے از خروارے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ دیگ کے چند چاول بتا دیتے ہیں کہ دیگ کا کیا حال ہے۔ ہمارے ہاں کے ایک بہت بڑے ابھرتے ہوئے دانشور‘ جنہیں اب میڈیا میں بھی اور کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی میں بھی بڑا مقام حاصل ہو گیا ہے وہ اس بات کا پرچار کر رہے ہیں کہ اسلام میں پردہ نہیں ہے‘

پردے کا کوئی مستقل حکم نہیں ہے‘ بلکہ یہ تو ایک خاص زمانے کا کلچر تھا‘ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کلچر تو ہے‘ لیکن یہ مسلم کلچر ہے‘ جو صرف اُس زمانے کے لیے نہیں تھا‘ بلکہ یہ کلچر ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس لیے کہ جب اسلام آیا ہے تو عرب میں کوئی ثقافتی خلا (cultural vacume) تو نہیں تھا۔ ان کا اپنا کلچر تھا۔ وہاں ایسی عریانی نہیں تھی جو آج ہے۔ عورت کا لباس پورا ہوتا تھا اور اُس دورِ جاہلیت میں بھی معزز گھرانوں کی عورتیں بڑی سی چادر (جلباب) میں لپٹ کر باہر نکلتی تھیں۔ صرف یہ کہ چہرہ کھلا رہتا تھا۔ تو اس طریقے سے ایک کلچر موجود تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بن سنور کر نکلنا اور لوگوں کی نگاہوں میں کھبنا بھی عام تھا‘ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی‘ مخلوط معاشرت بھی تھی۔

اب اُسی معاشرت کے اندر اسلام نے تبدیلیاں کیں۔ پہلی بات یہ فرمائی: ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ (الاحزاب:۳۳) ’’(مسلمان عورتو!) اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور قدیم زمانۂ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو!‘‘ تمہاری اصل جگہ تمہارا گھر ہے۔ بن سنور کر باہر نکلنا اور اپنے نسوانی حسن کی نمائش کرنا تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ دیکھو جب گھر سے کسی ضرورت کے تحت نکلنا پڑے تو اپنے جلباب کا ایک پلّو اپنے چہرے کے آگے بھی نقاب کی صورت میں لٹکا لیا کرو ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ﴾ (الاحزاب:۵۹) تاکہ تمہارا چہرہ چھپ جائے۔ نسوانی حسن کا سب سے بڑا انڈیکس چہرہ ہوتا ہے‘ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں نہ آئے۔ اُس معاشرے میں اوڑھنی یا دوپٹّہ (خمار) بھی موجود تھا اور عام عورت کام کرتے ہوئے اس کو اپنی کمر کے گرد کس لیتی تھی یا پھر اسے گلے میں ڈال لیا جاتا تھا۔ اس سے سر کو اچھی طرح ڈھانپنے اور خاص طور پر سینے کو چھپانے کا معاملہ نہیں تھا۔ اس ضمن میں یہ ہدایت دی گئی کہ تم اپنا سر بھی ڈھانپو اور اپنے گریبانوں کے اوپر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مارو ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ﴾۔ عورت کے نسوانی حسن کا ایک بہت بڑا حصّہ اس کا سینہ بھی ہے‘ اس کو مزید چھپاؤ۔ پردے کے ان قرآنی احکام کے زیر اثر وہ مسلم تہذیب پروان چڑھی ہے جس کا میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ اس نے

ہمارا طرزِ تعمیر بھی تبدیل کر دیا۔ اور پھر یہ سارا جو تمدنی نظام بنا ہے یہ انگریزوں کے دور میں بھی ختم نہیں ہوا۔ فرانسیسی‘ ولندیزی اور اطالوی مسلم ممالک پر قابض رہے لیکن مسلم تہذیب وتمدن کا یہ ڈھانچہ (structure) قائم رہا۔ لیکن اب اس کے خلاف عالمی سطح پر مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کی بنیادیں ہلا دی جائیں۔ چنانچہ پردے کے بارے میں ہمارے دانشوروں کے نئے نئے موقف اسی مہم کا حصّہ ہیں۔

میں نے اپنے ایک تفصیلی خطاب میں واضح کیا تھا کہ پردے چار ہیں‘ ایک نہیں۔ پہلا پردہ جو ایک کرٹن کی طرح ہمارے پورے معاشرے کے اندر تنا ہوا ہے وہ عورتوں اور مَردوں کا عدمِ اختلاط (seggregation of sexes) ہے۔ یعنی مخلوط معاشرت نہ ہو۔ دعوتِ ولیمہ ہو رہی ہے تو ایک طرف مرد ہیں‘ ایک طرف عورتیں ہیں۔ یہ ہماری تہذیب کا تواتر ہے۔ لیکن اب اکثر مخلوط محفلیں بھی ہوتی ہیں۔ اسلام میں عورتوں پر کام کرنے کی پابندی نہیں ہے‘ تعلیم حاصل کرنے کی پابندی نہیں ہے‘ لیکن ان کا مردوں کے ساتھ اختلاط جائز نہیں ہے۔ ان کے دفاتر اور تعلیمی ادارے الگ ہونے چاہئیں۔ دوسرا پردہ یہ ہے کہ عورت گھر سے نکلے تو جلباب کے اندر لپٹی ہوئی ہو اور اپنے چہرے کے اوپر بھی اس کا ایک پلّو لٹکا لے۔ اسی جلباب نے بعد میں برقع کی شکل اختیار کر لی‘ جس میں عورت کو آسانی ہو گئی کہ اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بچے کو بھی سنبھال سکتی ہے اور ساتھ کوئی اور شے بھی اٹھا سکتی ہے۔ تیسرا پردہ چار دیواری کا ہے کہ گھر کے اندر صرف محرم داخل ہو گا‘ نامحرم اندر نہیں جائے گا‘ وہ بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں بیٹھے گا‘ چاہے وہ آپ کا داماد ہے۔ اس لیے کہ داماد کی محرم صرف آپ کی ایک بیٹی ہے جو اُس کی بیوی ہے‘ دوسری بیٹیاں اُس کی محرم نہیں ہیں۔ البتہ ساس محرم ہے۔ چوتھا پردہ ستر کا ہے کہ عورت اپنے محرموں کے سامنے بھی پورا جسم نہیں کھول سکتی‘ صرف چہرہ‘ ہاتھ اور پاؤں کھول سکتی ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصّہ باپ اور بھائی کی نظر میں بھی نہیں آنا چاہیے۔ مسلمان عورت کو گھر کے اندر بھی مستور رہنا چاہیے۔ اس کے بعد جو ہے وہ صرف شوہر کا معاملہ ہے۔ تو اسلام میں یہ چار پردے ہیں۔ یہ ہماری اسلامی تہذیب کی عظیم الشّان عمارت کی بنیادیں ہیں‘ جن پر آج

تیشہ چلایا جا رہا ہے۔ اور یہ ماسٹر سٹروک ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ عرب کا ایک کلچر تھا' اسلام نے اس کلچر کے اندر کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا۔ اس کی ایک مثال حج کی ہے۔ حج تو دورِ جاہلیت میں بھی ہو رہا تھا' لیکن تلبیہ میں انہوں نے شرک شامل کر دیا تھا: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ' اِلَّا شَرِیْکاً تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ ''مَیں حاضر ہوں' پروردگار مَیں حاضر ہوں! مَیں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' سوائے اُس شریک کے جس کا تُو ہی مالک ہے اور اُس کے پاس جو اختیارات ہیں وہ بھی تیرے ہی اختیار میں ہیں''۔ جیسے عیسائیوں کی تثلیث ہے کہ تین میں ایک' ایک میں تین' اسی طرح اس تلبیہ میں توحید بھی تھی اور شرک بھی تھا۔ اس میں سے شرک کا عنصر ختم کر دیا گیا اور تلبیہ کے الفاظ یہ مقرر کیے گئے: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ' اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ' لَا شَرِیْکَ لَکَ۔ بیت اللہ کا طواف پہلے بھی تھا' اب بھی ہے۔ منیٰ میں قیام پہلے بھی تھا' اب بھی ہے۔ قریش میدانِ عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تو حرم کے متولی ہیں' ہم حدودِ حرم سے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ صرف منیٰ میں ٹھہرتے تھے۔ اس کو روک دیا گیا اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ:۱۹۹) ''پھر جہاں سے اور لوگ واپس آتے ہیں وہیں سے تم بھی واپس آؤ''۔ تمہارا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ وقوفِ عرفہ حج کا رکن اعظم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْحَجُّ عَرَفَۃُ)) یعنی حج تو نام ہی عرفہ کا ہے۔ باقی تمام مناسک حج میں سے جو بھی چھوٹ جائے گا' اس کا آپ کوئی نہ کوئی ازالہ کر سکیں گے' لیکن اگر وقوفِ عرفہ نہیں ہوا تو حج نہیں ہوا۔ پھر یہ کہ وہ جب منیٰ میں دو یا تین دن قیام کرتے تھے تو اس میں اپنے آباء و اجداد کے قصے' ان کی بہادری کی داستانیں اور ان کے مناقب بیان کیا کرتے تھے۔ انہیں اس سے روک دیا گیا اور فرمایا: ﴿فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۰۰) ''جیسے تم اپنے آباء و اجداد کا تذکرہ کرتے تھے اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر''۔ چنانچہ جو چیز موجود تھی اسی میں اضافے اور کمی کے ساتھ حج کے مناسک بنا دیے

گئے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام سے پہلے جو عرب کلچر موجود تھا اس میں اصلاح کر کے اسے اسلامی کلچر بنا دیا گیا۔

یہی دانشور جو پردے کے قائل نہیں ہیں' یہ صاحب اس بات کا بھی پرچار کر رہے ہیں کہ اسلام میں موسیقی حرام نہیں ہے۔

ایک اور صاحب جو ان سے بھی بڑے دانشور ہیں اور قومی سطح پر ہماری بڑی محترم شخصیت ہیں' انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اسلام میں شراب حرام نہیں ہے' شراب پی کر نشے میں دھت ہو جانا حرام ہے۔ دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ قرآن میں شراب کے لیے ''حرام'' کا لفظ نہیں آیا۔ اب بتایئے ڈھٹائی کا کیا علاج ہے؟ قرآن شراب کو ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ﴾ یعنی ناپاک شیطانی عمل قرار دے رہا ہے' ﴿فَاجْتَنِبُوْہُ﴾ کا حکم دے رہا ہے کہ اس سے اجتناب کرو' اس سے بچو' اس سے دور رہو! (المائدۃ:۹۰) اگلی آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہو رہا ہے: ﴿فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''پھر کیا تم باز آتے ہو یا نہیں آتے؟'' اور وہ کہہ رہے ہیں کہ حرام کا لفظ تو نہیں آیا' لہٰذا مطلقاً شراب حرام نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں حرمتِ شراب کے احکام تدریجاً آئے ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۹) میں یہ بات فرما دی گئی کہ اس میں کچھ نفع کا پہلو بھی ہے لیکن اس کا نقصان اور گناہ کا پہلو زیادہ ہے۔ پھر سورۃ النساء (آیت ۴۳) میں فرمایا گیا کہ نماز کے قریب مت جانا جب تم نشے کی حالت میں ہو۔ اس کے بعد مذکورہ بالا آخری حکم سورۃ المائدۃ کے اندر آ گیا۔ اگر ان صاحب کی دلیل پر قیاس کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زنا حرام نہیں ہے' کیونکہ قرآن میں کہیں ''حُرِّمَ عَلَیْکُمُ الزِّنَا'' یا ''اِنَّمَا حَرَّمَ اللّٰہُ الزِّنَا'' جیسے الفاظ نہیں آئے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ﴿وَلَا یَزْنُوْنَ﴾ جو آیا ہے' وہ تو عباد الرحمٰن یعنی اللہ کے بہت اونچے بندوں کی صفات کا ذکر ہے۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی﴾ (بنی اسرائیل:۳۲) کا مفہوم کوئی دانشور یہ بیان کر سکتا ہے کہ جہاں زنا ہو رہا ہو اُس مقام کے قریب مت جاؤ۔ گویا اسی طرح کا مطلب نکالا جا سکتا ہے جیسا پرویز صاحب نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا مطلب نکالا ہے۔

اس وقت ایک اور بات یہ کہی جا رہی ہے کہ سود کھانا تو حرام ہے سود دینا حرام نہیں‘ اس لیے کہ قرآن میں صرف اکلِ ربا سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر سُنّتِ رسولؐ کا دامن چھوڑ دیا جائے تو اس طرح کی ٹھوکریں تو لازماً کھانا ہوں گی۔ یہ تو سُنّت سے معلوم ہوگا کہ:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ آکِلَ الرِّبَا وَمُوْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ وَقَالَ ھُمْ سَوَاءٌ

(رواہ مسلم)

’’رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے سود کھانے والے پر‘ اس کے کھلانے والے پر‘ اس کے لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر۔ اور فرمایا کہ یہ سب (سود کے گناہ میں) برابر کے شریک ہیں۔‘‘

اسی طرح یہ تو سُنّت ہی بتاتی ہے کہ نہ صرف شراب حرام ہے بلکہ ((کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ)) ’’ہر نشہ آور شے حرام ہے‘‘۔ (متفق علیہ) صحیح مسلم کی ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں: ((کُلُّ مُسْکِرٍ خَمْرٌ وَکُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ)) ’’ہر نشہ آور شے شراب ہی ہے اور ہر طرح کی شراب حرام ہے‘‘۔ گویا جس شے سے بھی نشہ ہو جائے وہ حرام ہے۔ چنانچہ سلفی علماء خاص طور پر سعودی عرب کے علماء تو تمباکو نوشی کو بھی حرام کہتے ہیں‘ کیونکہ اس سے بھی ایک نشہ سا ہوتا ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ)) ’’جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کر دے‘ اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے‘‘۔ یہ نہیں کہ تھوڑی سی شراب پی لی جائے تو اس سے جسم میں چستی آجاتی ہے‘ لہٰذا ٹھیک ہے۔ بہرحال یہ مثالیں میں نے دی ہیں کہ تہذیبی سطح پر مسلمانوں میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے ان خطوط پر کام ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب جو تا حال برقرار چلی آ رہی تھی‘ اور ابھی اس کے کچھ اثرات باقی ہیں اس کے خلاف عالَمِ کفر خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا ہے اور ہمارے اپنے کچھ دانشور اس کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ ’’تہذیبوں کے ٹکراؤ‘‘ کے حوالے سے مسلمان تہذیب کو ایک بہت بڑا چیلنج قرار دیا گیا ہے اور اس کو سبوتاژ کرنے کی کوششوں پر ذرائع ابلاغ کے ذریعے اربوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔

ایک بات اور بھی جان لیجیے کہ اب قرآن پر بھی حملہ کیا گیا ہے اور بلند ترین دانشورانہ سطح (highest intellectual level) پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اجتہاد قرآن کو over-rule کر سکتا ہے۔ قرآن سے صرف اصول لیے جائیں گے‘ قرآن کے جزئیات اور معیّن احکام خاص طور پر حدود صرف اپنے دور کے لیے تھے‘ یہ مطلق اور ابدی نہیں ہیں۔ قرآن سے اصول لے لو کہ چوری نہیں ہونی چاہیے‘ زنا نہیں ہونا چاہیے۔ باقی یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا‘ یہ اُس دور کے لیے تھا‘ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ زانی اور زانیہ کے لیے سو سو کوڑوں کی سزا صرف اُس دور کے لیے تھی۔ قرآن کے معیّن احکام خاص طور پر حدود و تعزیرات کا معاملہ صرف اُس دور کے ماحول کے اعتبار سے تھا۔ یعنی سُنّت تو سُنّت ہے‘ اس سے آگے بڑھ کر قرآن کے اوپر بھی ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی! حالانکہ یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ یہ ختم نبوت کا انکار ہے۔ اس لیے کہ تکمیلِ نبوت و رسالت ختم نبوت کا لازمی تقاضا ہے۔ یعنی آخری ہدایت آ چکی اور دین کی تکمیل ہو چکی‘ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳) اگر دین ابھی اس معنی میں مکمل نہیں ہوا‘ اور قرآن کا ایک ایک لفظ اگر حتمی نہیں ہے تو ابھی نبوت ختم نہیں ہونی چاہیے تھی‘ پھر تو ابھی وحی کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے تھا۔ اگر آپ کے نزدیک تمدنی ارتقاء اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ خود قرآن کے اندر بھی (معاذ اللہ) کوئی ردّ و بدل ہو سکتا ہے تو پھر گویا آپ نے ختمِ نبوّت کی مہر توڑ دی۔ اسی لیے غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں ختم نبوت کی نفی اور غلام احمد پرویز کے ہاتھوں سُنّت کی جو نفی ہوئی ہے یہ آپس میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں‘ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ اس گمراہی کا جادو اب سر چڑھ کر بول رہا ہے اور ایک عظیم سیلاب کی مانند اسلام کی بچی کھچی تہذیبی اقدار کو بھی ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔

کچھ علاج اس کا بھی.....؟

آخر میں عرض کر رہا ہوں کہ اس کا علاج کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کا علاج آسان

نہیں‘ لیکن ہمیں اپنی اُخروی فلاح ونجات کے لیے اپنی سی محنت اور سعی وجُہد تو کرنی ہی ہے‘ اس سے چشم پوشی نہیں کرنی۔ باطل کا طوفان بہت سخت ہے‘ لیکن ہمیں نہ صرف کھڑے رہنے کی بلکہ اس کا رخ موڑنے کی کوشش کرنا ہے۔ اصل میں تو اس کا رخ اُس وقت مڑے گا جب کسی اسلامی ملک میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کر کے دنیا کو دکھا دیا جائے اور اس کی برکات لوگوں کو بچشمِ سر نظر آ جائیں۔ تب اس دجّالیت کا توڑ ممکن ہوگا اور اس سیلاب کا رخ موڑا جا سکے گا۔ لیکن اس وقت بھی اس اصول کو عام کرنا اور خود اپنے ذہن کے اندر بٹھا لینا ضروری ہے کہ کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ لازم وملزوم ہیں‘ ان کے درمیان متن اور شرح کا تعلق ہے۔ قرآن متن ہے اور حدیث وسُنّت اس کی شرح ہے۔ ہر مسلمان حتی الامکان اس کی تبلیغ کرے‘ یہ بات اپنے رشتہ داروں میں‘ اپنے قریبی لوگوں میں‘ اپنے عزیزوں میں‘ اپنے دفتری اور کاروباری ساتھیوں میں پھیلائے۔ دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ ہم اسلامی اقدار پر اور اسلامی تہذیبی روایات پر سختی سے کاربند رہیں۔ ہم اپنے گھروں میں اسلامی پردہ رائج کریں‘ ستر وحجاب کے احکام نافذ کریں۔ یہ تو ہم کر سکتے ہیں۔ ابھی ہمارے ملک میں کوئی مصطفیٰ کمال پیدا نہیں ہوا۔ ایک شخص نے اس کو اپنا آئیڈیل ضرور قرار دیا ہے‘ لیکن ابھی کسی نے پردے پر جبری پابندی نہیں لگائی جیسا کہ ترکی میں ہو گیا تھا۔ یہ تو ہم نے مغربی تہذیب کو خود اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس سے اپنی جان چھڑاؤ اور اسلامی تہذیب کے ساتھ چمٹ جاؤ‘ تمسک کرو‘ چاہو تم اجنبی ہو جاؤ‘ چاہے تمہیں دقیانوسی کہا جائے‘ چاہے تم پر پھبتیاں کسی جائیں کہ ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو! یہ فنڈا منٹلسٹ ہیں‘ تاریک خیال لوگ ہیں‘ رجعت پسند قسم کے لوگ ہیں‘ یہ قدامت پرست ہیں‘ کٹھ ملّا ہیں‘ دنیا جو چاہے کہہ دے‘ لیکن برداشت کرو‘ استقامت کا مظاہرہ کرو!

میں اسی حدیث پر اپنی بات ختم کروں گا جو مَیں نے آغاز میں سنائی تھی:

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ غَرِيْبًا ، فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))

آج اسلام کی غربت اور اجنبیت کا سب سے بڑا دور آ چکا ہے۔ پہلے ریاستی اور سیاسی سطح پر

غربت کا دور آیا تھا‘ پھر معاشی سطح پر آیا اور اب تہذیبی اور سماجی سطح پر غربت کا دور آ چکا ہے۔ اسلام کے عائلی قوانین پر‘ ستر وحجاب کے احکام پر‘ عصمت وعفت کے تصوّر پر اور شرم وحیا کی اقدار پر جو حملہ ہوا ہے یہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ تو ان لوگوں کے لیے تہنیت اور مبارک باد ہے جو اسلام کی اس اجنبیت اور غربت کے دور میں خود غریب اور اجنبی بن جائیں۔ طعنے سنیں‘ لیکن کھڑے رہیں‘ ڈٹے رہیں‘ اسلام کو اور اسلامی اقدار کو سینے سے لگائے رکھیں‘ ان سے چمٹے رہیں۔ وہ لوگ ہیں جن کے لیے مبارک باد ہے‘ تہنیت ہے‘ بشارتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس معیار پر پورا اُترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمين والمسلمات oo

(مرتب: حافظ خالد محمود خضر)

بقیہ: بیان القرآن

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ ”اور آپ ان پر کوئی زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔“
آپ کا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ ہم نے آپؐ کو اس اختیار کے ساتھ نہیں بھیجا کہ آپؐ انہیں زبردستی حق کی طرف لے آئیں۔

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾﴾ ”پس آپ تذکیر کرتے رہیے اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔“
جس شخص کی روح مردہ نہ ہو چکی ہو گی اور اس میں تھوڑی سی بھی جان ہو گی اور جس کے اندر اخلاقی حس دم نہ توڑ چکی ہو گی اور بھلائی کی معمولی سی رمق بھی باقی ہو گی وہ آپ ﷺ کی باتیں سن کر قرآن کی تذکیر اور یاددہانی سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ یہاں پر ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ کے الفاظ میں حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ہدایت دی جا رہی ہے کہ آپؐ تبلیغ وتذکیر‘ انذار وتبشیر اور لوگوں کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرآن ہی کو بنائیں۔ اس حکم کے مقابلے میں آج اُمّتِ مُسلمہ کی مجموعی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود کو قرآن سے بالکل ہی بے نیاز کر لیا ہے اور دعوت وتبلیغ‘ وعظ ونصیحت اور تربیت وتزکیہ کے دیگر ذرائع اختیار کر لیے ہیں۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم‘ ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم oo

جنّت الفردوس کا عظیم مہمان
عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ

ازقلم: پروفیسر عبدالعظیم جانباز ☆

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اُن کے فکر و عمل کے انفرادی اور اجتماعی پہلو ان کا اندازِ جہاں بینی ان کا سلیقہ جہانبانی ان کی دینی بصیرت اور ان کا فقہی اجتہاد وغیرہ ہمارے لیے مشعلِ راہ اور دُنیوی واُخروی فتوحات و برکات کے حصول کا ذریعہ وسرچشمہ ہے۔ یہی ہمارے اصول وفروع ہیں۔ قرآنِ مجید میں انہیں کہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہ کا پروانہ ملا اور کہیں مُھْتَدُوْنَ' مُفْلِحُوْنَ' رَاشِدُوْنَ' فَائِزُوْنَ جیسے القابات سے نوازا گیا۔ ان کی حیاتِ طیبہ کو پڑھنا' سننا اور عملاً اختیار کرنے کی فکر وسعی کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے' جب کہ آج ہم اس سے بہت دور ہو چکے ہیں اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہمارے لیے اجنبی' نا آشنا اور اساطیر الاولین بن چکی ہے..... فالی اللہ المُشتکٰی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اصحاب پیکرِ صدق ووفا' ہدایت کا سرچشمہ اور ظلمتوں کے اندھیروں میں روشنی کا وہ عظیم مینار ہیں جن سے دنیا راہنمائی حاصل کرتی ہے۔ وہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کے لیے پیکرِ رُشد وہدایت ہیں۔

حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو فضیلت اور عظمت حاصل ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ وہ ''السابقون الاوّلون'' میں تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق' حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کے بعد وہ شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ ''ذُوالنُّورین'' تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیوں کو ان کے نکاح میں دیا۔ ''اُسد الغابہ'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو انہیں یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے نکاح میں دے دیتا''۔ ایسے غنی تھے کہ انہوں نے

☆ای میل: Azeemjanbaz77@gmail.com

اپنی ساری دولت کو دین اور ملّت کی نذر کر دیا۔ انہی کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر ''بیعتِ رضوان'' لی۔ ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنّت میں ہر نبی کا ایک ساتھی ورفیق ہوتا ہے' میرا ساتھی جنّت میں عثمانؓ ہوگا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کاتبِ وحی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مسجد الحرام اور مسجدِ نبویؐ کی توسیع کرانے کی سعادت میسّر آئی۔ آپؓ نے تمام عالمِ اسلام کو ایک مصحف اور قراءت پر جمع کیا اور ''جامع القرآن'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سیرتِ عثمانی کے غیر معمولی اوصاف کے پیشِ نظر ان کے لیے ''کامل الحیاء والایمان'' کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی فتوحات تاریخ اسلام کا ایک شاندار باب ہیں۔ آپ کے عہد کی فتوحات نے آرمینیا' آذربائیجان' ایشیائے کوچک' ترکستان' کابل' سندھ' قبرص اور اسپین وغیرہ میں عربوں کے سیاسی اقتدار کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔ آپؓ ہی کے زمانے میں مسلمانوں کی بحری طاقت منظّم ہوئی۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی سلطنت کی وسعت ۴۴ لاکھ مربع میل تک پہنچ گئی تھی۔ آپؓ کا زمانہ خلافت بارہ سال پر محیط ہے۔

نام ونسب وخاندان

عثمان نام' ابوعبداللہ اور ابوعمرو کنیت' والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروٰی تھا۔ قریش کی شاخ بنواُمیّہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کا سلسلہ نسب والد اور والدہ دونوں کی طرف سے پانچویں پشت میں عبدمناف پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ نیز حضرت عثمانؓ کی نانی اُمِّ حکیم بیضاء بنت عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔

ولادت

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق آپؓ کی ولادت واقعہ فیل کے چھ سال بعد مکہ میں ہوئی۔ (الاصابہ: ۲/۸/۱۲۳۸)

پیشہ

قریش کا عام پیشہ تجارت تھا' اس میں انہوں نے بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ قرآنِ مجید کی سورۂ قریش میں گرمی اور سردی کے موسم میں قریش کے تجارتی قافلوں کا ذکر ہے۔ قریش کے اسی عام میلان کے باعث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی تجارت کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک شخص ربیعہ بن

حارث کی شرکت میں کپڑے کا کاروبار بہت بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا۔ اس میں انہوں نے ایسی کامیابی اور شہرت حاصل کی کہ ان کا لقب ہی 'غنی' ہو گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فطرتاً بڑے حلیم، سخی اور اعلیٰ اخلاق وفضائل کے مالک تھے، اسی بنا پر قریش میں نہایت معزز ومحترم تھے اور قریش ان سے اتنی محبّت کرتے تھے کہ وہ ضرب المثل بن گئی تھی۔ چنانچہ عرب کہا کرتے تھے ''اُحِبُّکَ وَالرَّحمٰنِ حُبَّ قریش عثمان'' یعنی ''مَیں تجھ سے بخدا ایسی محبّت کرتا ہوں جیسی محبّت قریش عثمان سے کرتے ہیں۔''

قبولِ اسلام

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے کلمہ پڑھنے کے فوراً بعد دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع فرمایا تھا، جس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ قبولِ اسلام میں آپ کا چوتھا نمبر ہے۔

اخلاقِ حمیدہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت وتربیت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت کی تشکیل اور کردار کی تعمیر اس حد تک کی کہ آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رنگ میں رنگے گئے۔ آپؓ کے خصائل و اوصاف انبیائے کرام علیہم السلام سے مشابہہ تھے۔ ابن عساکر راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عثمانؓ سب صحابہ سے خلق میں مجھ سے زیادہ مشابہ ہیں۔

منکسر المزاج

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بے حد منکسر المزاج اور متواضع شخصیت کے حامل تھے اور اپنے مقام ومرتبہ کا خیال نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ امام مالکؒ کے دادا بیان کرتے ہیں کہ میں نے کئی بار دیکھا کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما جب مکہ سے مدینہ واپس آتے تو مدینہ سے ذرا پہلے مُعَرَّس مسجد (ذوالحلیفہ) میں قیام فرماتے اور جب مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے لیے سوار ہوتے تو سواری پر پیچھے کسی کو ضرور بٹھاتے۔ اگر کوئی بڑا نہ ملتا تو کسی لڑکے کو ہی بٹھا لیتے اور اسی حال میں مدینہ میں داخل ہوتے۔ راوی کہتے ہیں کہ کیا تواضع کے خیال سے بٹھایا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں تواضع کے خیال سے بھی بٹھاتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ پیدل آدمی کو سواری مل جائے، اس کا بھی فائدہ ہو جائے، نیز وہ بادشاہوں جیسے نہ ہوں (کہ وہ تو کسی عام آدمی کو اپنے پیچھے بٹھاتے نہیں)۔ حضرت میمون بن مہرانؒ کہتے ہیں کہ مجھے ہمدانی نے بتایا کہ میں نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ خچر پر سوار ہیں اور ان کا غلام نائل اُن کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے، حالانکہ آپ اس وقت خلیفہ تھے۔

حلیۂ مبارک

آپ کا رنگ سفید تھا جس میں کچھ زردی کی آمیزش تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چاندی اور سونا دونوں کو مخلوط کر دیا گیا ہے، خوبصورت اور خوش قامت تھے۔ دونوں ہاتھوں کی کلائیاں خوش منظر تھیں۔ بال سیدھے تھے یعنی گھنگریالے نہیں تھے۔ جب عمامہ زیب سر کر لیتے تھے تو بڑے حسین وجمیل نظر آتے تھے۔ ناک ابھری ہوئی، جسم کا نچلا دھڑ بھاری، پنڈلیوں اور دونوں بازوؤں پر بال کثرت سے تھے۔ سینہ چوڑا، کاندھوں کی ہڈیاں بڑی بڑی، چہرے پر چیچک کے کچھ نشانات، دانت ہموار اور خوبصورت تھے۔ داڑھی بڑی گنجان، زلف دراز، اخیر عمر میں زرد خضاب کرنے لگے تھے، جسم کی کھال ملائم اور باریک تھی۔

سلیم الفطرت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فطرتاً بڑے نیک، راست باز اور ایمان دار تھے۔ شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جو لوگ پیتے تھے فخر کرتے اور نہ پینے والے کو طعن کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک شراب نہ پینا بخل کی علامت تھا۔ لیکن اس ماحول میں دولت وثروت کے ساتھ رہنے کے باوجود آپ ان چند اکابر قریش (مثلاً حضرت عباس، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہ) میں سے تھے جو سلیم الفطرت ہونے کے باعث شراب سے نفرت کرتے تھے۔ اسی طرح گانا بجانا، لہو ولعب اور زنا کاری عرب کے پسندیدہ مشاغل میں تھے، لیکن حضرت عثمانؓ ان سب چیزوں سے بھی طبعاً مجتنب تھے، چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا: میں نے عہد جاہلیت میں یا اسلام میں نہ کبھی زنا کیا ہے، نہ شراب پی ہے اور نہ گانا بجایا ہے۔

غذا

غذا بھی عمدہ اور پُرتکلّف استعمال فرماتے تھے، آپ پہلے خلیفہ تھے جن کے لیے آٹا چھانا جاتا تھا۔

اندازِ گفتگو

آپ فطرتاً کم گو تھے، لیکن جب کسی موضوع پر اظہارِ خیال فرماتے تو بلیغ وفصیح اور سیر حاصل گفتگو کرتے۔

لباس

بڑے پیمانے پر تجارت کے باعث آپ کا شمار اہلِ ثروت میں ہوتا تھا' اس لیے فَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے استفادہ آپ کی طبیعت کا شیوہ تھا' چنانچہ لباس بھی عمدہ قسم کا استعمال کرتے لیکن اپنے لباس میں سُنّت کا خیال رکھتے تھے۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ آدھی پنڈلی تک لنگی باندھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میرے محبوب ﷺ کی لنگی ایسی ہوا کرتی تھی۔

دینی خودداری اور حمیت

اسلام نے آپؓ کی فطرت کو چمکا کر مجلّٰی اور مصفّٰی کر دیا تھا' اس بناء پر دینی حمیت اور خودداری آپ میں اس درجہ کی تھی کہ نازک سے نازک موقع پر بھی اس میں لچک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ آپؓ فرمایا کرتے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو' مبادا وہ وقت آجائے کہ تمہارے بروں کو تم پر مسلّط کر دیا جائے اور ان بُروں کے خلاف نیک لوگ بددعا کریں اور وہ قبول نہ کی جائے۔

عبادت وخشیت

عبادت' قربِ الٰہی اور انابت الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے' اس لیے اپنے چند در چند مشاغل اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود عبادت کثرت سے کرتے اور فرائض وواجبات کے علاوہ نوافل کا بھی بکثرت اہتمام کرتے تھے۔ نماز بے حد خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے' اس میں اس درجہ یکسوئی اور محویت ہوتی تھی کہ گردوپیش کی کوئی خبر نہ رہتی۔ اس کے ساتھ ساتھ خشیت الی اللہ بھی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

خدمت لینے سے گریز

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی ذات کے لیے خدمت بہت کم لیا کرتے تھے۔ اگرچہ خدام اور کنیزوں کی بہتات تھی' لیکن ان کے آرام کا خیال رکھتے۔ حضرت عبداللہ رومیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رات کو اپنے وضو کا انتظام خود کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ اگر آپ اپنے کسی خادم سے کہہ دیں تو وہ یہ انتظام کر دیا کرے گا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ رات ان (خُدّام) کی اپنی ہے جس میں وہ آرام کرتے ہیں۔

حضرت زبیر بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ میری دادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خادمہ تھیں' انہوں نے مجھے بتایا کہ (تہجد کے وقت) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں میں سے کسی کو نہ جگاتے۔ ہاں اگر کوئی از خود اٹھا ہوا ہوتا تو اسے بلا لیتے اور وہ آپ کو وضو کے لیے پانی لا دیتا۔

ذُوالنُّورین

ذُوالنُّورین کا مطلب ہے دو نور والا۔ آپ کو ذُوالنُّورین اس لیے کہا جاتا ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں یکے بار دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں۔ کسی بھی نبی کا اُمتی یہ اعزاز نہ حاصل کر سکا۔ جب آپؓ کی بیوی سیّدہ حضرت اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں ہوتیں تو میں ایک ایک کر کے عثمانؓ کے نکاح میں دے دیتا۔

آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں کیا جاتا ہے یعنی وہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں جنّت کی بشارت دی تھی۔ بزبانِ نبوت آپ کو متعدد بار جنّتی ہونے کی بشارت نصیب ہوئی۔ آپؓ نے جب اپنی دولت دین پر نچھاور کرنے کی حد کر دی تو نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرما دیا: ''عثمان آج کے بعد کوئی عمل کرے یا نہ کرے' عثمان جنّتی ہے!''

ازواج واولاد

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلا نکاح آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا' لیکن ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر جلد انتقال ہو گیا۔ اسی کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ سیّدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کی دوسری صاحبزادی سیّدہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ ۲ ہجری میں جس روز غزوۂ بدر ختم ہوا اُسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اور نکاح فرمایا۔

اوصاف وکمالات

سفید رنگ' خوبصورت وجاہت' متوازن قد وقامت' چہرے پر چیچک کے نشانات' داڑھی گنجان اور زلف دراز کے حامل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب نفیس لباس زیب تن کر کے عمامے سے مزین

ہوتے تو بڑے خوبصورت معلوم ہوتے۔ آپؓ خوش شکل اور خوش قامت ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سیرت و کردار کی خلعت سے آراستہ تھے۔ بڑے پیمانے پر تجارت کے باعث شروع ہی سے دولت مند تھے' اس لیے لباس بھی عمدہ پہنتے تھے۔ آپؓ کی غذا عمدہ اور اعلیٰ معیار کی تھی' آپؓ لذیذ اور نفیس غذاؤں کو پسند فرماتے تھے۔ تاہم بہت بڑے مال دار ہونے کے باوجود آپؓ کا طرزِ زندگی سادگی سے عبارت تھا۔ رہن سہن' اخلاق و اطوار اور خلق و کردار میں آپ آنحضرت ﷺ کے طریقوں کو مشعلِ راہ بناتے' آپؓ کا ہر کام اتباعِ سُنّت سے آراستہ ہوتا۔ ایک مرتبہ آپؓ وضو سے فارغ ہو کر مسکرائے' لوگوں نے اس موقع پر مسکراہٹ کی وجہ پوچھی تو آپؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کے بعد اسی طرح مسکراتے دیکھا ہے''۔ (مسند احمد بن حنبلؒ)

ایک مرتبہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ کر بکری کے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا منگوایا' اسے تناول فرمایا اور تجدید وضو کے بغیر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ فراغت کے بعد ارشاد فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی جگہ بکری کا گوشت تناول فرمایا تھا اور پھر اسی طرح بغیر تجدید وضو کے نماز پڑھی تھی۔''

تقویٰ و طہارت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جوہرِ ذاتی تھا' گناہ و معصیت اور کفران و عصیان سے آپؓ کی طبیعت کو نفور تھا' سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے: ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ چند لوگوں کے ہاں مدعو تھے۔ یہ مجمع گانے بجانے جیسے ناپسندیدہ مشغلہ میں مصروف تھا' لیکن جب حضرت عثمانؓ وہاں پہنچے تو مجمع منتشر ہو چکا تھا۔ آپؓ کو اس قبیح واقعہ کا علم ہوا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور بطورِ کفّارہ ایک غلام آزاد کیا۔ (صفۃ الصلوٰۃ)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول و فعل سُنّتِ رسول ﷺ کے اتباع سے معمور تھا' آپ کا قلب و ذہن احترامِ رسول ﷺ' عشقِ مصطفوی اور شیفتگی حق سے آراستہ تھا۔ آپؓ کے اجتہادات' فرامین و مراسلات اور خطبات و تقاریر آنے والی پوری اُمتِ مُسلمہ کے لیے خزانہ عامرہ ہیں۔

اہلِ حقّہ کا متفقہ نظریہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے بلند مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا' ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اور یہ نظریہ حضور ﷺ کی زندگی ہی میں صحابہ کرامؓ کا تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

كُنَّا نُخَيِّرُ بَيْنَ النَّاسِ فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَنُخَيِّرُ اَبَا بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ثُمَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُم (صحیح البخاری: ۱/۵۱۶)

''ہم حضور ﷺ کے زمانے میں لوگوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے تھے' سب سے بہتر حضرت ابوبکرؓ کو سمجھتے تھے' ان کے بعد حضرت عمرؓ کو اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کو۔''

ہجرت

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے پہلے اللہ کے لیے جس نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کی وہ حضرت عثمان بن عفّانؓ ہیں' جنہوں نے پہلی ہجرت مکّہ سے حبشہ کی طرف فرمائی اور دوسری مدینہ کی طرف۔ اسلام کی خاطر دو مرتبہ ہجرت کرنے کی وجہ سے آپؓ کا لقب ''ذوالہجرتین'' بھی ہے۔

جمع قرآن

جب آپؓ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم و ایران کے دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ قرآنِ مجید سات لغتوں میں نازل ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سات لغات میں تلاوت فرماتے تھے۔ قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیل گیا۔ جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کا نزول سات لغات پر ہوا ہے اس وقت تک اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی' لیکن جب یہ اختلاف ان دور دراز کے ممالک میں پہنچا جن میں یہ بات پوری طرح سے مشہور نہیں ہوئی تھی کہ قرآن سات لغات پر نازل ہوا ہے تو وہاں جھگڑے پیدا ہونے لگے۔ بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسری کو غلط کہنے لگے تو اُس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُمّت کو لغتِ قریش پر جمع فرمایا' یہ آپ کی اجتہادی شان کا عظیم کارنامہ ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن پاک پورے کا پورا لکھا جا چکا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے پاس الگ الگ اجزاء تھے' لیکن ایک مصحف (نسخہ) میں جمع نہیں ہو پایا تھا۔ البتہ حُفّاظِ کرام کے سینوں میں مکمل محفوظ تھا۔ عہد صدیقی میں اسلامی جنگوں میں حُفّاظ کرام زیادہ شہید ہونے لگے' تو کچھ ممتاز صحابہؓ نے آپؓ کی توجہ اس طرف دلوائی کہ قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے' یہ نہ ہو کہ کسی حافظ کی شہادت کے وقت کوئی آیت قرآنی اُس کے ساتھ ہی چلی جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہؓ کے ذریعے مکمل قرآن پاک کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کروا دیا۔ اور یہ نسخہ اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رکھوا دیا گیا۔ عہدِ

فاروقی میں یہی صورتحال رہی۔ عہدِ عثمانی میں جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور عجمی لوگ بھی زیادہ تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے' تو ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔ عرب تو رسم الخط اور قراءت کے اختلاف کو سمجھتے تھے' لیکن عجمیوں کے لیے یہ صورت حال بالکل نئی تھی۔ چنانچہ رسم (الخط) اور قراءت (لہجے) کا اختلاف بڑھنے لگا اور فتنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تو اکابر صحابہؓ کے توجہ دلانے اور غور و فکر کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہ مصحفِ صدیقی منگوایا اور اس کی نقول تیار کروا کر تمام اسلامی صوبوں کے صدر مقامات پر بھجوائیں۔ ساتھ ہی ایک ایک ممتاز قاری' قراءتِ قریش کا ماہر بھیجا تا کہ رسم الخط اور قراءت دونوں کا اختلاف ختم ہو سکے۔ یہ آپؓ کے لیے رہتی دنیا تک صدقہ جاریہ اور اُمّتِ مُسلمہ پر آپ کا عظیم احسان ہے۔

کتابتِ وحی

چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے' لہٰذا اسلام لانے کے بعد آپ کو کتابتِ وحی کا شرف بھی حاصل ہوا' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے خود عثمان رضی اللہ عنہ کو اِس گھر میں دیکھا ہے کہ رات کے وقت گرمی کے موسم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی ہے' جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسبِ معمول گرانی محسوس کر رہے ہیں اور حضرت عثمانؓ آپ کے حکم سے وحی لکھ رہے تھے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب و احترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ پروانہ وار عشق و محبّت کا لازمی نتیجہ تھا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کوئی بات اشارۃً و کنایۃً بھی فرمائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو امرِ محکم کی طرح گرہ میں باندھ لیا اور اس کی بجا آوری کو اپنا وظیفۂ زندگی سمجھا۔

پہرہ کا عدم اہتمام

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہرے کا کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا کرتے تھے' چنانچہ حضرت حسن بصریؒ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ مسجد میں ایک چادر میں سوئے ہوئے تھے اور ان کے پاس کوئی بھی نہیں تھا' حالانکہ اُس وقت آپ امیر المؤمنین تھے۔

غلاموں کی آزادی

غلام آزاد کرنا اسلام میں ایک بڑا عمل صالح اور عظیم کارِ ثواب ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے' لہٰذا ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔ اور اگر کسی جمعہ میں ایسا نہ کر سکتے تو اگلے جمعہ کو ایک ساتھ دو غلام آزاد کر دیتے۔

انشاء و تحریر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تحریر و انشاء میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ کی تحریریں خطوط کی شکل میں حدیث و تاریخ اور ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں (جو کہ اب اردو میں ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط'' مرتبہ پروفیسر خورشید احمد صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے نام سے منظر عام آ چکے ہیں) ان پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ کلام مَا قَلَّ وَدَلَّ کا مصداق ہوتا ہے' الفاظ مرصع اور جملے کے جملے فصاحت و بلاغت کی جان اور نہایت مؤثر و دلنشین ہوتے ہیں۔

امورِ خلافت و انتظامِ ملکی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت منہاجِ نبوت پر قائم رکھی۔ مجلس شوریٰ بالکل اسی طرح برقرار رکھی جس طرح آپ سے پیشتر خلفاء کے دور میں تھی۔ اہم امور میں آپ تمام اکابر صحابہؓ' مشیرانِ خلافت اور ضرورت پڑنے پر اُمّہات المؤمنینؓ سے مشورہ لیتے۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دور آیا تو مشرق و مغرب کی انتہاء تک اللہ کا دین پھیل گیا۔ الٰہی لشکر ایک طرف اقصائے مشرق تک اور دوسری طرف انتہائے مغرب تک پہنچ گئے اور مجاہدین کی تلواروں نے اللہ کی توحید کو دنیا کے گوشے گوشے اور چپّے چپّے میں پہنچا دیا۔ اندلس' قیرواں' سقیفہ یہاں تک کہ چین تک آپ کے زمانہ میں فتح ہوئے۔

دوسری طرف مدائن' عراق' خراسان' اہواز سب فتح ہوئے۔ ترکوں سے جنگ ہوئی' آخر ان کا بڑا بادشاہ خاقان خاک میں ذلیل و خوار ہوا اور زمین کے مشرقی اور مغربی کونوں نے اپنے خراج بارگاہ خلافت عثمانؓ میں پہنچائے۔ آپ کے زمانے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ پیشین گوئی ایک حد تک پوری ہو گئی: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو میرے لیے سمیٹ دیا یہاں تک کہ میں نے اس کے مشرق و مغرب کو دیکھ لیا' عنقریب میری امت کی سلطنت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک زمین مجھے سمیٹ کر دکھائی گئی ہے۔''

اولیاتِ عثمانؓ

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت سے کاموں کا اجراء فرمایا' جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱) بیت المال سے مؤذنین کے لیے وظائف کا تقرر فرمایا۔
۲) فوجیوں کے وظائف میں سو سو درہم اضافے کا اعلان کیا۔
۳) تمام مسلمانوں کو ایک قراءت پر متفق کیا۔
۴) جمعہ کی نماز کے لیے ایک اور اذان کا اضافہ فرمایا۔
۵) زمینوں پر مالکانہ حقوق کے پروانوں کا اجراء فرمایا۔
۶) بیت المال کے اونٹوں اور گھوڑوں کے چرنے کے لیے چراگاہوں کا بندوبست فرمایا۔
۷) دارالقضاء کے لیے علیحدہ عمارت تعمیر فرمائی اور قاضیوں کا تقرر فرمایا۔
۸) بیت المال' مہمان خانوں وغیرہ کے لیے الگ الگ عمارات تعمیر فرمائیں۔
۹) جدہ کی بندرگاہ اپنی نگرانی میں تعمیر کرائی۔
۱۰) جگہ جگہ ضرورت کے تحت سڑکیں اور پل تعمیر کروائے۔
۱۱) اسلام میں مسلمانوں کے لیے اول وقف عام کرنے کے واسطے رومہ کا کنواں خریدا۔
۱۲) اسلام میں اول مہاجر مع اہل وعیال فی سبیل اللہ ہیں۔
۱۳) ملک شام میں سمندری جہازوں کے بنانے کا کارخانہ قائم کیا۔
۱۴) سب سے پہلے محتسب کا تقرر آپ نے فرمایا۔
۱۵) مدینہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے ایک بند تعمیر کرایا۔
۱۶) جگہ جگہ پانی کی نہریں کھدوائیں۔
۱۷) اسلامی بحری بیڑے کی بنیاد رکھی' بحری افواج قائم کیں اور بحری فتوحات بھی آپ کے عہد میں ہوئیں۔
۱۸) مسجد حرام اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر وتوسیع پر خاص توجہ فرمائی۔

شہادتِ کبریٰ

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس محبوب خلیفہ کو ایک عظیم سازش' جو کہ درحقیقت اسلامی تاریخ کا سب سے اول اور عظیم فتنہ تھا' کے بعد اس عالم میں قتل کر دیا گیا کہ آپؓ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے' کئی دن کے روزے سے تھے اور اپنے گھر میں محصور تھے۔ اگرچہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سمیت کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے گھر کے دروازے پر پہرہ بھی دے رہے تھے' لیکن اس کے باوجود بلوائی آپ کے گھر میں پیچھے کی سمت سے داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور عین تلاوتِ قرآن کی حالت میں خلیفہ وقت اور امیر المومنین کو شہید کر دیا گیا۔ یہ عظیم سازش جو عبداللہ بن سبا سمیت متعدد منافقین کی سعی کا نتیجہ تھی' درحقیقت صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نہ تھی بلکہ اسلام اور تمام مسلمانوں کے خلاف تھی۔ چنانچہ آپؓ کی شہادت کے بعد سے آج تک مسلمان تفرقہ اور انتشار میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اس سے نکل نہ سکے۔ یہ وہ بات تھی جس کی خبر حضرت عثمانؓ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ اللہ کی قسم! اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھ سکو گے نہ ایک ساتھ جہاد کر سکو گے۔

آپؓ کی شہادت پر مدینہ میں ایک کہرام مچ گیا۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو! واجب ہے کہ اس بداعمالی پر کوہِ اُحد پھٹے اور تم پر گرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت عثمانؓ جب تک زندہ تھے اللہ کی تلوار نیام میں تھی' اس شہادت کے بعد یہ تلوار نیام سے نکلے گی اور قیامت تک کھلی رہے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ بھی نہ کیا جاتا تو لوگوں پر آسمان سے پتھر برستے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر ملی تو آپؓ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں تیرے حضور خونِ عثمانؓ سے براءت کا اظہار کرتا ہوں''۔ ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان پر گر پڑے اور رونے لگے' حتیٰ کہ لوگوں نے خیال کیا کہ آپ بھی ان سے جا ملیں گے۔

امام اعمش اور حافظ ابن عساکر نے صاحبِ اسرار رسول حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلا فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ہے اور سب سے آخری فتنہ خروجِ دجال ہے۔ اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! وہ شخص جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خواہش ہے' اگر اس نے دجال کو پا لیا تو وہ اس کی پیروی کیے بغیر نہیں مرے گا اور اگر اُس نے اسے نہ پایا تو وہ اپنی قبر میں اس پر ایمان لائے گا۔

❁❁❁

چند مشہور عربی تفاسیر اور اُن کی خصوصیات

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

علم تفسیر کے عظیم الشان ذخیرے میں سے چند مشہور عربی تفاسیر اور ان کی امتیازی خصوصیات کا ذیل میں مختصر ذکر پیش خدمت ہے:

(۱) جامع البیان فی تفسیر القرآن المعروف تفسیر طبری

اس کے مؤلف امام ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید طبریؒ ہیں۔ آپ ۲۲۴ھ میں طبرستان کے مقام آمل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے آپ 'رے' پہنچے۔ وہاں کے علماء سے کسبِ فیض کے بعد آپ امام احمد بن حنبلؒ سے علم حدیث حاصل کرنے کی خاطر بغداد روانہ ہوئے۔ لیکن امام طبری کے پہنچنے سے کچھ دن قبل امام احمد بن حنبلؒ وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے کوفہ اور بصرہ کا رخ کیا اور وہاں علم فقہ سے سیراب ہوئے۔ پھر مصر کے لیے رختِ سفر باندھا' لیکن راستے میں علم حدیث کی پختگی کے لیے دِمشق ٹھہر گئے۔ پھر مصر پہنچ کر وہاں بھی اپنی علمی پیاس بجھائی۔ آخر میں واپس بغداد پہنچے اور طبرستان کے دو اسفار کے علاوہ باقی ساری زندگی اسی شہر میں گزار دی۔ بالآخر یہیں ۳۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔

امام طبریؒ نہ صرف قرآن و حدیث اور فقہ کے ماہر تھے بلکہ قراءت' تاریخ' تعدیل' ادب اور طب میں بھی آپ کو خاصا درک حاصل تھا۔ خطیب بغدادیؒ نے بھی اپنی ''تاریخ بغداد'' میں ان خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ آپ نے نہ صرف اپنے زمانے کے مشہور و معروف علمائے کرام اور فقہائے عظام سے استفادہ کیا بلکہ خود بھی اپنی استعداد سے ان علوم میں مہارت حاصل کی۔ مصر سے واپسی پر آپ کچھ عرصہ امام شافعیؒ کے مقلّد رہے' پھر ایک جداگانہ مسلک کی بنیاد ڈالی جو آپ کے والد کی نسبت سے ''جریریہ'' کے نام سے معروف ہوا۔ آپ نے امام شافعیؒ سے اصول میں کم اور فروع میں زیادہ اختلاف کیا' لیکن امام احمد بن حنبلؒ سے آپ کا اختلاف زیادہ تر اصولی تھا اور

امام طبری ان کو مجتہد کی بجائے صرف محدّث مانتے تھے۔ اس زمانے میں بغداد میں حنابلہ کا زور تھا اور حکومتی سرپرستی بھی انہیں حاصل تھی' اس لیے بسا اوقات آپ کو اختلافات کی بنا پر ان سے ضرر بھی پہنچا اور مخالفت بھی چلتی رہی۔ ایک موقعہ پر تو چند آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں اختلاف کی بنیاد پر مخالفین نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور پتھراؤ شروع ہو گیا۔ ناظم بغداد نے بڑی مشکل سے اس فتنے کو رفع کیا اور آپ کی جان کی حفاظت کی۔ اس زمانے میں چونکہ مسالک اربعہ کا سکّہ جم چکا تھا اور مخالفین کی تعداد بھی کم نہ تھی' اس لیے آپ کا مسلک زیادہ عرصہ نہ چل پایا۔ تصنیف و تالیف میں مصروفیت کا یہ عالَم تھا کہ تقریباً چالیس سال تک امام طبری روزانہ چالیس صفحات لکھتے رہے۔ آپ کی تفسیر آثاری کتب تفسیر کی سب سے بڑی نمائندہ ہے۔ پہلے امام طبری نے اس تفسیر کو تیس ہزار صفحات اور تین سو حصوں میں رقم فرمایا۔ مگر جب شاگردوں کے سامنے یہ تفسیر آئی تو انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ اتنی ضخیم تفسیر کو کون پڑھے گا' اس کی تلخیص کر دی جائے۔ اس پر امام طبری نے اس کا خلاصہ تین ہزار صفحات اور تیس حصوں میں کیا۔ اب یہ تفسیر گیارہ جلدوں اور تیس حصوں میں موجود ہے۔ اکثر جگہ آپ لکھتے ہیں کہ میں طوالت سے بچنے کے لیے اختصار سے کام لے رہا ہوں۔ چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلے امام صاحب تفسیر کرتے وقت متعلقہ آیت کے تحت اس کے ایک ایک لفظ کے معنی لکھتے ہیں۔ پھر آیت سے متعلق تمام احادیث کو جمع کرتے ہیں' لیکن نقل حدیث میں کئی ضعیف احادیث بھی اس میں جگہ پا گئی ہیں۔

(۲) اس کے بعد امام طبری صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے اقوال یا سند درج کرتے ہیں' البتہ اس تفسیر میں ضحاک کے جو اقوال بروایت بشر بن عمارہ منقول ہیں' وہ ضعیف ہیں' کیونکہ بشر ساقط الاعتبار اور کمزور راوی ہے۔

(۳) اکثر جگہ امام صاحب اختلافِ قراءت کو بھی واضح کرتے ہیں۔ اسی طرح لغوی اور نحوی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴) اس تفسیر میں فقہی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ امام صاحب مختلف اقوالِ متقدمین درج کر کے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اس کی وجوہ بھی بیان کرتے ہیں۔

(۵) اشعارِ عرب سے بھی استشہاد کیا گیا ہے' جیسے ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ کی تفسیر میں امام

صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اَنداد ، نِدّ کی جمع ہے اور اس کے معنی مثل اور ہمسر کے ہیں' جیسے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

اَتَهجُوه وَلَستَ لَهٗ بِنِدٍّ فَشَرُّكُمَا لِخَيرِكُمَا الفِدَاء

''(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کرنے والے!) کیا تو اُن کی ہجو کرتا ہے' درآنحالیکہ تو اُن کے برابر نہیں ہے۔ پس تم دونوں میں سے جو برا ہے' وہ اچھے پر قربان ہو جائے۔''

(۶) وجوہ استنباط مسائل اور وجوہ اعراب کو بھی کما حقہ واضح کیا گیا ہے۔

(۷) امام ابن جریر طبری نے تمام قدیم تفسیری نسخوں سے استفادہ کیا اور ان کی روایات کو محفوظ کیا' اس لیے آپ کی تفسیر جمع روایات حدیث' اختلافِ قراءت' مختلف فقہی مسائل' عقائد' علم کلام ولغت' ادب' ردّ فرقۂ باطلہ' معترضین کے جواب اور مسائل صرف ونحو کی جامع ہے۔ گویا کہ اس سے پیشتر تمام تفسیری مجموعوں کا خلاصہ اور علوم کا خزانہ اس میں محفوظ ہو گیا ہے۔

امام طبری خود لکھتے ہیں کہ میں یہ تفسیر لکھنے سے قبل تین سال تک اللہ کے حضور دعا کرتا اور اس کی استعانت کا طلب گار رہا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج روئے زمین پر پورے قرآن پاک کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے اور اپنی تالیف سے لے کر آج تک یہ تمام تفاسیر کا مصدر و ماخذ ہے۔ اس سے صرفِ نظر کر کے کوئی تفسیر لکھنا گویا ناممکن ہے' اسی لیے بجا طور پر ''اُمّ التفاسیر'' کے اعزاز کی یہی واحد مستحق ہے۔

امام ابوحامد اسفرائنی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو اس نے کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی۔ امام سیوطی نے ''الاتقان'' میں اس کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ نقلِ روایت' توجیہِ اقوال اور ترجیح استنباطِ مسائل میں یہ تفسیر اپنی مثال آپ ہے۔ امام نوویؒ اور ابن السبکیؒ بھی اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں۔ اس تفسیر کے مؤلف کے متعلق ابنِ خزیمہ کی یہ رائے ہے: فما اعلم علی ادیم الارض اعلی من ابن جریر۔ خطیب بغدادی آپ کے علم وفضل کے بارے میں کہتے ہیں: وکان ابن جریر احد الائمۃ الاعلام۔

امام طبریؒ کی دیگر اہم اور خاص تصنیف تاریخ کے موضوع پر کتاب 'تاریخ الامم والملوک' ہے جس میں ۳۰۲ھ تک کے واقعات اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان ہے' جو کہیں اور اس سے بہتر انداز میں مکمل اور یکجا نہیں ملتی۔

(۲) تفسیر القرآن العظیم المعروف تفسیر ابن کثیر

اس کے مؤلف امام ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن عمرو بن کثیر المعروف حافظ ابن کثیرؒ ہیں۔ آپ ۷۰۰ھ میں بمقام ''مجدل'' پیدا ہوئے جو اُس وقت شام کے مشہور قصبے بُصریٰ کے مضافات میں واقع تھا۔ سات سال کی عمر میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی' بعد میں بھائی کے ساتھ تحصیل علم کے لیے دِمشق آ گئے۔ یہیں حافظ ابن کثیر نے علّامہ ابن تیمیہ' جمال الدین مزی' علّامہ ذہبی' حافظ ابن سویدی اور ابن عساکر (رحمہم اللہ) سے خوب علمی استفادہ کیا اور احادیث کی سماعت کی۔ آپ نے اپنے اساتذہ کی حیات میں ہی اعلیٰ علمی مقام حاصل کر لیا' خصوصاً تفسیر وحدیث اور تاریخ میں آپ کو امام مانا گیا ہے۔ فراغتِ علم کے بعد آپ اپنے استاد علامہ ابن تیمیہؒ کے ساتھ ہی منسلک ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی صاحبزادی سے آپ کی شادی بھی ہو گئی۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بقیہ زندگی ابن تیمیہ کی رفاقت میں ہی گزاری اور ان کے مصائب وآلام اور مخالفین کی اذیتیں سہنے میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخری عمر میں آپ کی بصارت جاتی رہی۔ ۷۷۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا' اپنے استاد علامہ ابن تیمیہؒ کے قرب میں صوفیہ نامی قبرستان میں دفن ہوئے۔

آپ کی تفسیر روایات وآثار کا ایک معتمد علیہ ذخیرہ ہے۔ ذخیرۂ تفاسیر میں اسے جو مقام حاصل ہوا' وہ شاذ ونادر ہی نصیب ہوتا ہے۔ روایت ودرایت کی جامعیت کے لحاظ سے محدّثین کی تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تمام امت نے اس کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری کا قول ہے کہ یہ تفسیر تمام متقدم اور متأخر تفاسیر حتیٰ کہ ابن جریر سے بھی بے نیاز کرنے والی ہے۔ اکثر مدارس اسلامیہ میں یہ شامل نصاب ہے۔ اسے تفسیر سلفی بھی کہا گیا ہے۔

اس کی چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) علّامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدّمہ میں تفسیر قرآن پر ایک نہایت معلومات افزا اور پُرمغز مقالہ بھی لکھا ہے۔

(۲) علّامہ اپنی تفسیر میں پہلے آیت کا آسان مطلب بیان کرتے' پھر اس کی تشریح دوسری آیاتِ قرآنی کی روشنی میں کرتے ہیں' نیز باہمی ربط کو بھی بیان کرتے ہیں۔ گویا ''القرآن یفسّر

بعضه بعضًا'' پر آپ کا عمل ہے۔ اس کے بعد اس سے متعلقہ احادیث مع سند وحوالہ تحریر کرتے ہیں' آخر میں آثارِ صحابہؓ اور تابعینؒ کی باری آتی ہے۔

(۳) آپ کی تفسیر کا بڑا ماخذ تفسیر طبری ہے۔ آپ جو روایات وآثار ضبطِ تحریر میں لائے' ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت اس پر جرح وتنقید بھی کرتے ہیں۔ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح اور بعض کو ضعیف بیان کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی لکھتے جاتے ہیں۔ تفسیری ادب میں تنقیدی اسلوب پہلی مرتبہ آپ نے ہی قائم کیا ہے۔

(۴) تفسیر میں موقعہ بموقعہ قرآن وتجوید' صرف ونحو اور فصاحت وبلاغت پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

(۵) کلامی مسائل پر بھی کئی جگہ بحث کرتے ہوئے علّامہ ابن کثیرؒ نے مسلک اہلِ سُنّت کی تائید کی ہے۔

(۶) اس تفسیر میں کئی مقامات پر لمبی چوڑی فقہی بحثیں بھی کی گئی ہیں۔ جیسے ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط﴾ (البقرۃ:۱۸۵) کے تحت چار مسائل بیان کر کے دیگر مفسّرین کے اقوال ودلائل نقل کیے گئے ہیں۔ ایسے ہی طلاق وخلع پر لمبی چوڑی بحث کی گئی ہے۔ فقہی مسائل پر طول واختصار سے بچتے ہوئے اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہے۔ دیگر آراء اور مسالک بیان کرنے میں علامہ نے نہایت دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

(۷) اسرائیلی روایات کے حوالے سے علامہ ابن کثیر نے دوسروں سے الگ رویّہ اختیار کیا ہے۔ کہیں تو آپ لمبی چوڑی اسرائیلی روایات لے آتے ہیں اور کہیں بالکل اعراض کر جاتے ہیں۔ مثلاً ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ط﴾ (البقرۃ:۶۷) کے تحت بقرہ سے متعلق آپ نے لمبی چوڑی بحث کی ہے' مگر آخر میں سلف کا موقف ہی قبول کیا ہے۔ ایسے ہی 'قٓ' کے تحت یہ اسرائیلی روایت بیان کی ہے کہ یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جس نے تمام دنیا کو گھیر رکھا ہے اور آخر میں فرماتے ہیں کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ علامہ ابن کثیر متنبّہ بھی کرتے جاتے ہیں کہ ہمارا اس پر اعتقاد نہیں' نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب' مگر جس بات کو عقلِ سلیم قبول کرے۔

دس جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر گویا تمام متقدم تفاسیر کی جامع ہے اور سلسلہ تفاسیر سے استفادے کے لیے یہ اکیلی ہی کفایت کرسکتی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

علامہ ابن کثیر روایت ودرایت کے جامع تھے اور خصوصاً علمِ حدیث میں آپ کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ احادیث کی اسناد اور متون پر آپ کو کامل عبور تھا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ اور علامہ زاہد الکوثریؒ بھی آپ کے علم وفضل کے معترفین میں شامل ہیں۔ حسین الذہبیؒ نے آپ کو امام' محدّث' مفسّر' فقیہہ اور مفتی لکھا ہے۔ ''شذرات الذهب'' میں آپ کے متعلق تحریر ہے: '' كان كثير الاستحضار' قليل النسيان' جيّد الفهم''۔ دیگر علماء نے بھی آپؒ کی تحسین کی ہے۔ آپ کی دیگر ممتاز اور اہم تصنیف علمِ تاریخ پر مستند کتاب ''البداية والنهاية'' ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر آپ کے زمانے تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر (تفسیر رازیؒ)

اس کے مؤلف امام ابوعبداللہ فخر الدین محمد بن عمر بن حسین رازیؒ ہیں۔ آپ کی پیدائش ۵۴۴ھ میں بمقام رے (خراساں) ہوئی۔ تعلیم والد ماجد ضیاء الدین (المعروف خطیب رے)' کمال الدین سمعانی اور شیخ مجد الدین جنبلی سے حاصل کی۔ امام رازی کی ابتدائی زندگی تنگ دستی میں گزری۔ پھر آپ کے لڑکے کی شادی ایک متمول سوداگر کی لڑکی سے ہوگئی' جس کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ سوداگر کی وفات کے بعد ساری دولت امام صاحب کے گھر آ گئی' یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا۔ تحصیل علم کے بعد امام صاحب نے درس وتدریس اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ اعلیٰ پائے کے خطیب تھے' عربی کے ساتھ فارسی میں بھی وعظ کہا کرتے۔ خشیتِ الٰہی کا یہ حال تھا کہ دورانِ وعظ گریہ طاری ہو جاتا۔ حلقۂ درس میں دور دراز سے طالب علم آتے اور ہمہ وقت لگ بھگ تین سو شاگرد آپ کی معیت میں رہا کرتے تھے۔ امام رازی رے میں ہی ۶۰۶ھ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

سیّد مرتضیٰ الزبیدی نے شہاب کی شرح الشفاء سے نقل کیا ہے کہ امام رازی اپنی تفسیر سورۃ الانبیاء تک مکمل کر سکے تھے کہ آخری وقت آ پہنچا۔ باقی تفسیر شہاب الدین خلیل احمد دمشقی (م ۶۳۹ھ) اور قاضی نجم الدین المخزومی (م ۷۲۷ھ) نے یکے بعد دیگرے مکمل کی۔ علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ سورۃ الفتح تک امام رازی کی اپنی تفسیر کا ہونا یقینی ہے' اس کے بعد تکملہ نگاروں نے مکمل کی ہے۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ تفسیر کبیر کے کچھ حصہ کی تکمیل امام صاحب کے بعد ہوئی

ہے۔تکملہ نگاروں نے اپنا کام اس خوبی سے نبھایا ہے کہ اول سے آخر تک پوری تفسیر ایک ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تفسیر مصر اور استنبول سے آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

ذیل میں تفسیر کبیر کی اہم خصوصیات درج کی جاتی ہیں:

(۱) یہ تفسیر اپنے وقت کے تمام علوم متداولہ کی جامع ہے اور اس میں یونانی فلاسفہ، ملحد متکلّمین اور خلافِ اہلِ سُنّت فرقوں کا خوب ردّ کیا گیا ہے۔

(۲) امام رازیؒ نے ان تمام اعتراضات کا فلسفہ و منطق اور علم کلام کے حوالے سے مدلّل اور مفصّل جواب دیا ہے جو مختلف باطل گروہوں کی جانب سے اسلام پر وارد ہو رہے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر رہے تھے۔

(۳) علم کلام میں چونکہ امام صاحب اشعریہ کے حامی تھے، اس لیے معتزلہ کی زوردار تردید کی گئی ہے، نیز کلامی بحثوں کا زور ہے۔

(۴) صاحبِ تفسیر چونکہ خود مسلک اہلِ سُنّت سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ساری تفسیر میں یہی رنگ جھلکتا ہے۔

(۵) دیگر مفسّرین کے مختلف اقوال پر تنقید کی گئی اور پسندیدہ قول کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔

(۶) اثباتِ ربوبیت والوہیت کے بھی گرانقدر علمی مباحث اس تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔

(۷) کئی جگہ معتزلہ اور صوفیاء کے ان اقوال کو اختیار کیا گیا ہے جو موافقِ عقل ہونے کے ساتھ موافقِ نقل بھی ہیں۔

(۸) اس تفسیر میں نظمِ قرآنی کے ساتھ ربطِ آیات وسُور پر بھی توجّہ دی گئی ہے۔

(۹) تفسیر کبیر اپنے قارئین پر فہم قرآنی کے نئے دروازے کھولتی ہے، انہیں آیاتِ قرآنی سے استخراجِ احکام کا طریقہ سلجھاتی، نیز ان پر غور وفکر کے نئے نئے زاویے روشن کرتی ہے۔

(۱۰) مختصراً فقہی، نقلی، عقلی، کلامی، منطقی اور لغوی لحاظ سے یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

امام رازی، فقہ شافعی کے جیّد عالم نیز منقولات اور علم الکلام میں یگانۂ عصر تھے۔ محمد حسین الذہبی آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''فکان امامًا فی التفسیر والکلام والعلوم العقلیة وعلم اللغة''۔ یہ جو ایک ناحق بات مشہور ہو گئی ہے کہ تفسیر کبیر میں سوائے تفسیر کے اور سب کچھ ہے، اس کا ردّ کرتے ہوئے مولانا عبدالحق حقانیؒ کا کہنا ہے کہ ان کی تفسیر میں سب کچھ ہے،

مگر روایت میں کم پایہ ہے۔ بہرحال اتنا زیادہ کم پایہ بھی نہیں کہ استفادہ ہی نہ کیا جا سکے۔ مولانا محمد مالک کے نزدیک یہ تفسیر علوم عقلیہ اور معارف وحکمت کا ایک عظیم الشان اور بہترین ذخیرہ ہے۔ لطائف واسرارِ کلام اللہ اور اصولِ دین کی تحقیق میں ایسی تفسیر اُمّت میں شاید کسی نے پیش نہ کی ہو۔ فلاسفہ اور ملحدین کا ردّ دلائل عقلیہ اور اصولِ کلام سے خوب کیا ہے۔ اثباتِ ربوبیت والوہیت کے وہ نادر اور گراں قدر مباحث ہیں کہ ان کی عظمت اور برتری کے لیے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ امام صاحب کا اُمّتِ مسلمہ پر یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا بدلہ صرف حق تعالیٰ کی رحمتیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔

دراصل ہمیں کسی تفسیر کا جائزہ لیتے وقت اس دور کی علمی، ثقافتی اور سیاسی صورت حال کو بھی مدّنظر رکھنا چاہیے۔ امام رازی کا دور وہ تھا کہ نئے نئے فلسفیانہ اور متکلّمانہ فتنے اور بدعتی گروہ سر اٹھا رہے تھے۔ عقلی اور منطقی موشگافیوں کا سہارا لے کر اسلام میں نئی نئی باتیں اور نکتے پیدا کیے جا رہے تھے۔ فلسفۂ یونان سے متاثرہ لوگ دین اسلام اور شریعت کو بھی اسی فلسفہ کے قواعد وضوابط کے مطابق پرکھ رہے تھے اور عامۃ الناس کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر رہے تھے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ان ملحد فلاسفہ اور متکلمین کو انہی کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر شکست فاش دی جائے اور عوام کو ان کی گمراہیوں سے بچایا جائے۔ خدا تعالیٰ امام رازی کو جزائے خیر دے کہ آپ نے اپنے زمانے میں ان ملحدین کا ان ہی کے ہتھیاروں کی مدد سے خوب مقابلہ کیا اور ان کو سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آپ کی تفسیر میں متقدمین کے نہج سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب پیدا ہو گیا۔ منطقی، کلامی اور فلسفیانہ بحثیں کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گئیں جو کہ شاید حالات کی مجبوری تھی۔ علماء کے لیے بھی یہ ایک نیا پن تھا اور ان کو بھی سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی، کیونکہ وہ اس قسم کے نکات اور بحثوں کے عادی نہیں تھے۔ بس اسی لیے تفسیر کبیر پر یہ فتویٰ بھی لگا دیا گیا: فیه کل شیء الّا التفسیر۔ اس پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ارشاد ہے کہ یہ کہنا اس بلند پایہ علمی تفسیر کو اپنے مقام ومرتبہ سے گرانا ہے۔ امام رازیؒ کے دور کے مسائل اور ماحول کو سامنے رکھے بغیر اس تفسیر کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دراصل کسی بھی تفسیر سے استفادہ کے لیے صاحبِ تفسیر کے مزاج اور اس کی تفسیر کے اسلوب سے ہم آہنگ ہونا لازمی امور میں شامل ہے۔ ❁❁❁

تنظیم اسلامی کے تحت

”اصلاحِ تحریر کمیٹی“ کا قیام

تنظیم اسلامی دین کی اشاعت اور نظامِ خلافتِ راشدہ کے قیام کے لیے اپنی بساط اور محدود وسائل میں رہ کر جِدّوجُہد کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اس عظیم کام کو آگے بڑھانے کے لیے نئے اور باصلاحیت لوگ آگے آتے رہیں‘ تاکہ یہ قافلہ رواں دواں رہے‘ تا آنکہ منزل ہمارا مقدّر ہو۔ اسی تناظر میں تنظیم کے فکر‘ مشن اور بدلتے حالات میں صحیح راہنمائی کے لیے پُرعزم اور مثبت سوچ کے حامل ایسے رفقاء کی ایک ٹیم ناگزیر ہے جو تحریر کا ذوق رکھتے ہوں۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کی مرکزی سطح پر باصلاحیت اہل قلم افراد کی تلاش (Talent hunt) کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے‘ جس کے کنوینر محترم حافظ عاکف سعید صاحب ہیں‘ جبکہ جناب پروفیسر محمد یونس جنجوعہ اور انجینئر مختار حسین فاروقی ان کے معاونین ہیں۔

رفقاءِ تنظیم اسلامی کی خدمت میں بالعموم اور حلقہ جاتی نظم سے بالخصوص درخواست ہے کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تحریری کام کی صلاحیت رکھنے والے رفقاء کو اس کام پر آمادہ کریں اور مرکز اطلاع دیں۔ ان تحریروں کی وصولی‘ چھان بین‘ رابطہ‘ راہنمائی اور اشاعت سے متعلق قواعد و ضوابط جلد ہی بذریعہ نظم حلقہ جات کو فراہم کر دیے جائیں گے..... اللہ تعالیٰ ہمیں اس نیک کام کی انجام دہی میں اپنے حصے کا کام باحسن طریق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کنوینر کمیٹی

ضروری وضاحت: رفقاء نوٹ فرمالیں کہ آئندہ سے ”اصلاحِ تحریر کمیٹی“ کے حوالے سے بھجوائے جانے والے مضامین قرآن اکیڈمی کے بجائے مرکز تنظیم اسلامی کے پتے پر ارسال کیے جائیں۔ اسی طرح اس مقصد کے لیے ای میل بھی مرکز ہی کی استعمال ہوگی۔

دارالاسلام‘ مرکز تنظیم اسلامی‘ 23 کلومیٹر ملتان روڈ‘ چوہنگ‘ لاہور

ای میل: markaz@tanzeem.org

اہلِ قلم حضرات توجّہ فرمائیں!

کوئی مضمون لکھتے وقت محض موضوع کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا ہی کافی نہیں ہوتا‘ بلکہ تحریر کے علمی و ادبی معیار کی جانب توجّہ دینا بھی ضروری ہے۔ حتّی الوسع کوشش کی جانی چاہیے کہ زبان و بیان کے حوالے سے کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ کوئی مضمون یا نظم لکھنے کے لیے محض نیک جذبات یا بلند خیالات رکھنا ہی کافی نہیں ہوتا‘ بلکہ جس صنف میں اظہار مطلوب ہے‘ اس کے قواعد و ضوابط سے مکمّل آگاہی بھی لازم ہے۔

اپنے خیالات کو اشعار کی صورت دینے والے حضرات اکثر اوقات شعری لوازمات نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ردیف‘ قافیہ‘ بحر اور بالخصوص وزن کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ سمجھنا چاہیے کہ محض ردیف کی کسی قدر پابندی کرنے سے شعر کا وزن قائم نہیں ہو جاتا‘ بلکہ وزن اور بحر کے اپنے پیمانے ہیں‘ جن کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح آزاد نظم بھی ہر اصول سے آزاد نہیں ہوتی‘ اس کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

مضمون نگاروں کو چاہیے کہ وہ ازراہِ کرم ان اُمور کا خاص خیال رکھیں:

- موضوع سے متعلق درست اور مکمل معلومات حاصل کریں۔
- کسی نکتے کی تکرار تحریر کو بوجھل بنا دیتی ہے‘ اس سے اجتناب ضروری ہے۔
- جب ایک بات ختم ہو جائے تو اس کے بعد نیا پیرا شروع کیجیے۔
- کوشش کیجیے کہ جملے چھوٹے ہوں۔ یہ نہ صرف سمجھنے میں آسان ہوتے ہیں بلکہ عبارت کو خوب صورت بھی بناتے ہیں۔
- رموزِ اوقاف پر بھی توجّہ دیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ پورا پیراگراف ایک ہی جملے پر مشتمل ہو!
- اپنی نگارشات تحریر کرتے ہوئے صفحے کے حاشیے اور سطور کے مابین مناسب جگہ خالی چھوڑیے تاکہ اصلاح کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ تحریر کا شوق رکھنے والے حضرات درج بالا نکات کو پیش نظر رکھا کریں گے!..... فجزاھم اللہ احسن الجزاء!!

❁❁❁

سرگزشتِ حیات

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

میری پیدائش تقسیم ہند سے قبل جنوری ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ میرے والدین جنڈیالہ شیر خان (ضلع شیخوپورہ) میں رہتے تھے۔ یہ ضلع پاکستان میں شامل رہا جہاں ہندو مسلمان اتفاق اور سلوک کے ساتھ رہتے تھے۔ ہندو اپنے مکان خالی کر کے یہاں سے نکل گئے' مسلمانوں نے انہیں عزّت کے ساتھ جانے دیا۔ جو مکان ہندو چھوڑ گئے' ان میں مہاجرین کو آباد کیا گیا جو اپنے مکانات چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔

میرے والد دو بھائی تھے جو پیار اور محبّت کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ دونوں کی یہ مشترکہ رہائش تھی۔ دونوں کی بیٹیاں تھیں۔ دونوں نے اپنی بیٹیوں کی شادی بھی کر دی مگر اکٹھے ہی رہے۔ ان کی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ ان کو مشورہ دیا گیا کہ دونوں بھائی الگ الگ ہو جاؤ' ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اولادِ نرینہ سے نوازے' چنانچہ دونوں بھائی الگ الگ ہو گئے۔ خدا کا کرنا ہوا کہ دونوں کے ہاں بیٹے ہوئے۔ میری پیدائش پر بڑی خوشی منائی گئی۔ عورتوں کے مشورے سے اچھے شگون کے طور پر میرے کانوں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے رِنگ (ring) لٹکائے گئے۔ چھ سال کی عمر ہوئی تو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جب ساتھی بچوں نے میرے کانوں میں رِنگ دیکھے تو تعجب کرنے لگے۔ میں نے گھر والوں سے کہا کہ یہ اُتار دیں' چنانچہ وہ رِنگ اُتار دیے گئے۔ میرے والد صاحب فوج میں ٹھیکیدار تھے جو فوجیوں کو یونیفارم مہیّا کرتے تھے۔ وہ اُس وقت بنگال کے شہر رانچی میں تھے۔ اسی اثنا میں تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا تو انہوں نے واپس اپنے گھر آنا تھا' چنانچہ چند فوجیوں کے ہمراہ وہ ٹرین میں گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ راستے میں انہوں نے جگہ جگہ خونی مناظر دیکھے۔

گھر پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان فسادات سے گزر کر خیریت سے اپنے اہل وعیال سے آملے۔ مہاجرین ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں میں آباد ہو چکے تھے۔ میرے والد صاحب

کو ہندوؤں کے گھروں کا پتہ تھا جہاں اب مہاجرین آباد ہو چکے تھے۔ وہ دن کے وقت گھر سے نکلے اور مہاجرین کے مکانوں کو پہچانتے رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں ان گھروں کے اندر چپکے سے تھوڑی تھوڑی رقم ڈال دی۔

میری والدہ بھولی بھالی ناخواندہ خاتون تھیں۔ وہ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتی تھیں۔ نماز کی پابند تھیں۔ ۱۹۶۰ء میں جب میری شادی ہوگئی تو اپنی بہو سے سبقاً سبقاً قرآن ناظرہ پڑھنا سیکھ لیا۔ میری بیوی پڑھی لکھی نہ تھی' مگر سمجھ دار اور سلیقہ شعار تھی۔ میرے ماں باپ کی خدمت گزار تھی۔ مجھے آگے پڑھنے کا شوق تھا' چنانچہ اس نے تمام گھریلو ذِمہ داریاں سنبھال لیں اور مجھے ایسا ماحول دیا کہ میں دل جمعی کے ساتھ اپنی تعلیم بڑھانے میں لگا رہا۔ میرے والد سلیم الفطرت دانا انسان تھے۔ وہ بھی ناخواندہ تھے مگر انہیں تعلیم کا بہت شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے انہوں نے معمولی پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا۔ ان کی گاؤں میں دکان تھی۔ دیہاتوں میں اکثر ادھار چلتا ہے۔ والد صاحب کو ادھار لے جانے والے کا نام لکھنا پڑتا تھا جو وہ لکھ لیتے تھے۔ مثلاً صابر کو سابر لکھ لیتے۔ جب ہم لوگ ہنستے تو کہتے مَیں تو ایک دن بھی سکول نہیں گیا' تاہم لوگوں کے نام جیسے تیسے لکھ لیتا ہوں' جو مجھے ہی پڑھنے ہوتے ہیں' مَیں پڑھ لیتا ہوں۔

والد صاحب کے والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تو انہوں نے اپنے چچا کے ہاں پرورش پائی جو بڑے سخت مزاج تھے۔ ان کی دکان تھی۔ میرے والد صاحب ان کی دکان میں چھوٹے موٹے کام کرتے۔ حُقّہ پینے کا عام چلن تھا۔ میرے والد صاحب کو بھی حُقّہ تیار کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس ماحول میں انہوں نے بھی حقہ پینا شروع کر دیا۔ پھر یہ عادت پختہ ہوگئی اور دن کے علاوہ رات کو بھی وہ حقے کے بغیر نہ رہ سکتے۔ مگر اپنے بچوں کو تمبا کو نہ پینے کی نصیحت کرتے۔ جب ہم ان سے پوچھتے کہ حُقّہ اگر بُری چیز ہے تو آپ کیوں پیتے ہیں؟ وہ کہتے کہ میرے ماں باپ بچپن میں فوت ہو گئے' چنانچہ میں والدین کی تربیت سے محروم رہا۔ میرے ماحول نے مجھے حُقّہ پینے پر لگا دیا' اب یہ چھوڑا نہیں جا سکتا۔ تمہارے والدین زندہ ہیں جو تمہیں حقہ پینے سے روکتے ہیں۔ اگر پھر بھی تم لوگ تمبا کو پینا شروع کر دو تو میرے بچپن میں اور تمہارے بچپن میں کیا فرق رہ گیا؟

میرے ماموں سمجھ دار اور دانا آدمی تھے۔ انہوں نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی بھی کر لی مگر اولاد نہ ہوئی۔ ان کی احساسِ محرومی نے میری والدہ کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ

انہوں نے ہمارا چھوٹا بھائی ان کو دے دیا جسے انہوں نے بڑے پیار اور شفقت سے پالا۔

ہمارے گاؤں میں مڈل سکول تھا (جہاں اب کالج ہے)۔ لڑکے پانچ پانچ چھے چھے میل سے پیدل چل کر سکول آتے۔ میری سکول کی تعلیم شروع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا دیا تھا' چنانچہ میں ہر کلاس میں اوّل رہتا۔ میرا چھوٹا بھائی محمد یعقوب ضیاء بہت ذہین تھا۔ اس نے ایم اے انگلش پرائیویٹ پاس کیا اور صوبائی سیکرٹیریٹ سے ایڈیشنل سیکرٹری فنانس ریٹائر ہوا۔

اُس وقت پہلی چار جماعتیں پرائمری کہلاتی تھیں۔ چوتھی جماعت کے بچوں کا ضلعی صدر مقام میں وظیفے کے لیے الگ سے امتحان ہوتا۔ اس امتحان کا طریقہ کار اکثر زبانی ہوتا۔ لڑکوں کو ایک مضمون کا پرچہ دیا جاتا اور اُسی وقت وہاں موجود استاد پرچہ چیک کر لیتے۔ جن لڑکوں کی کارکردگی غیر معمولی نہ ہوتی انہیں اسی وقت فارغ کر دیا جاتا۔ اسی طرح دوسرے پرچے بھی ہوتے اور بہت کم بچے باقی رہ جاتے۔

آخر میں جو ایک دو بچے رہ جاتے ان کو گورنمنٹ سکالرشپ کا اہل قرار دیا جاتا۔ اپنے سکول سے ہم جولڑکے وظیفے کے امتحان میں شامل ہوئے' ان سب میں میری پوزیشن اعلیٰ تھی' چنانچہ مجھے یہ وظیفہ ماہانہ کی بنیاد پر آٹھویں جماعت تک ملتا رہا۔ آٹھویں جماعت کا امتحان محکمہ تعلیم لیتا تھا اور اس امتحان کا نتیجہ اخبارات میں شائع ہوتا تھا۔ یہاں بھی سب سے اعلیٰ کارکردگی والے طالب علموں کو وظیفے کا اہل سمجھا جاتا۔ اس امتحان میں بھی میری پوزیشن نمایاں تھی' چنانچہ میرا وظیفہ لگ گیا' جو مجھے ہائی سکول کی نویں دسویں جماعت میں ملتا رہا۔ میٹرک بھی میں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا' مگر میرے والدین نے مجھے کالج میں داخل نہ کروایا۔ اُن دنوں ایف اے اور بی اے کے امتحان پرائیویٹ نہیں دیے جاسکتے تھے۔ البتہ جولڑکے فاضل کا امتحان پاس کر لیتے انہیں ایف اے کے لیے صرف انگریزی کا امتحان دینا پڑتا۔ چنانچہ میں نے فاضل فارسی کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں راہنمائی بھی مل گئی کہ شیخوپورہ میں ایک پرائیویٹ ادارہ ''جوہر کالج'' تھا جو فاضل فارسی کے امتحان کے لیے تیاری کرواتا تھا۔ میں نے اس میں داخلہ لے لیا۔ امتحان ہوا تو میری ضلع بھر میں امتیازی پوزیشن تھی۔

میرے والد صاحب کو ضرورت تھی کہ آمدنی میں اضافہ ہو اور مجھے چھوٹی موٹی نوکری مل جائے' چنانچہ ان کے ایک عزیز کی کوشش سے نزدیک کے گاؤں کے پرائمری سکول میں میری تقرری ہوگئی اور مَیں پرائمری سکول کے بچوں کو پڑھانے لگا۔ میں نے چند ماہ پڑھایا تو میرا داخلہ اساتذہ کے تربیتی ادارے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں ہوگیا۔ داخلہ خالص میرٹ کی

بنیاد پر ہوا۔ وہاں گیارہ ماہ کی تربیت کے بعد SV ٹیچر کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوگیا۔ ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ شیخوپورہ شہر کے ایک پرائیویٹ ہائی سکول میں مجھے ٹیچر رکھ لیا گیا' جہاں مَیں مڈل کلاسز کو پڑھاتا رہا۔ وہاں میں نے صرف تین ماہ کام کیا کہ میری تقرری بطور SV ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ میں ہوگئی جہاں میں نے پرائیویٹ ایف اے کا امتحان دیا اور کامیاب رہا۔ بی اے کی تیاری یہاں ممکن نہ تھی۔

جون ۱۹۶۳ء میں میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ لاہور میں ہوگیا' جہاں مَیں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے بی اے کا امتحان دیا اور کامیاب رہا۔ ۱۹۶۶ء میں سی ٹی اور ۱۹۶۷ء میں بی ایڈ کے امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیے۔ پھر میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایڈ کے لیے داخلہ لیا اور کامیاب ہوا۔ چونکہ اب میں ہائی کلاسز کو پڑھانے کا اہل ہوگیا تھا اس لیے میری تقرری گورنمنٹ ہائی سکول سینی بار ضلع شیخوپورہ میں ہوگئی جہاں مَیں سات ماہ رہا۔ پھر میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں ہوگیا جہاں سے میں نے میٹرک کیا تھا۔ اس سکول میں مَیں ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء پانچ سال رہا۔ پھر میرا تبادلہ اپنے آبائی گاؤں جنڈیالہ شیر خان میں ہوگیا جو اَب ہائی سکول تھا۔ اس سکول میں رہ کر مَیں نے ۱۹۷۳ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ پھر لیکچرار کے امتحان اور انٹرویو میں کامیاب ہوا تو ۱۹۸۴ء میں میرا تقرر بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں ہوا' جہاں مَیں پانچ سال رہا۔ پھر میرا تبادلہ MAO کالج لاہور میں ہوگیا جہاں مَیں تین سال پڑھاتا رہا۔ دریں اثنا میں نے اپنا مکان لاہور میں بنالیا۔ MAO کالج میرے گھر سے دور تھا۔ میری خواہش پر میرا تبادلہ گورنمنٹ FC کالج لاہور میں ہوگیا جہاں میں سات سال رہا اور جنوری ۲۰۰۱ء میں میری ریٹائرمنٹ ہوگئی۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے مَیں متعارف تھا اور میرے مضامین میثاق میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد مجھے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی قرآن اکیڈمی میں بلالیا گیا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی۔ پہلے چند سال تو مجھے اس جُزوقتی ملازمت کی معمولی سی تنخواہ ملتی رہی' مگر ۲۰۰۷ء سے مَیں نے تنخواہ چھوڑ دی اور اعزازی کام کرنا شروع کیا' جو اَب تک جاری ہے اور جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ میں تنظیم اسلامی کا رفیق ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ان کی زندگی میرے لیے بہت پُرکشش تھی' کیونکہ وہ مخلص مسلمان تھے اور اسلامی احکام پر پورے طور پر عامل تھے۔ جس چیز کو اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے اُس کے قریب بھی نہ

جاتے۔ان کی دعوت رجوع الی القرآن کی تھی۔ دین کی دعوت واشاعت کو مسلمان کا فرضِ عین سمجھتے تھے اور اس پر کسی طرح کی اُجرت یا معاوضہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتابوں اور دروس وخطابات کے کیسٹس/سی ڈیز وغیرہ پر قطعاً کوئی رائیلٹی نہیں لیتے تھے۔قرآن اکیڈمی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے رہے اور ۲۰۱۰ء میں وہیں انہوں نے وفات پائی۔

۱۹۸۶ء میں جوہر ٹاؤن سکیم میں پلاٹوں کی تقسیم ہوئی تو قرعہ اندازی میں میرا نام بھی نکل آیا اور بلاک بی میں ۷۹ نمبر پلاٹ مجھے الاٹ ہو گیا۔ چونکہ میں MAO کالج میں تھا اور میرے بیٹے بھی لاہور میں پڑھ رہے تھے اس لیے میں نے اس بے آباد جگہ پر اپنا مکان تعمیر کر کے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ مجھے بھی اور میرے بیٹوں کو بھی سہولت ہو گئی۔

اپنی جوانی کے آغاز ہی میں میرے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ مجھے اپنے دین کی صحیح تعلیمات کا علم ہونا چاہیے' چنانچہ میں نے قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اس سے مجھے کافی روشنی ملی اور میں نے جان لیا کہ عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔ میں نے سکول کی تعلیم میں عربی نہ پڑھی تھی۔ ہمارے ایک بزرگ عالم دین تھے' ان سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے مجھے ایک کتاب عربی کا معلم از مولوی عبدالستار پڑھنے کو کہا اور بتایا کہ اس کتاب کے ذریعے آپ استاد کے بغیر عربی زبان سیکھ لیں گے۔ چنانچہ میں نے مذکورہ کتاب خرید لی اور اس کو عربی زبان سیکھنے کے لیے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ ابھی میں نے اس کتاب کے دو حصے پڑھے تھے کہ مجھے عربی زبان سے کافی واقفیت ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں ایف اے' بی اے کی عربی کی کتابیں پڑھا لیتا تھا۔ اب مجھے قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے اور تفسیری نکات جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ جہاں بھی کہیں قریب کسی معروف عالم دین کی تقریر ہوتی تو میں وہاں پہنچ جاتا اور شروع سے آخر تک ان کی گفتگو سنتا۔ بڑے بڑے علماء جن کو میں نے سنا ان میں سے چند ایک یہ ہیں: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا احمد سعید کاظمی' قاری محمد طیب' مولانا عبدالستار تونسوی' احسان احمد شجاع آبادی' مولانا مفتی محمود' مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالمجید ندیم' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا مفتی محمد شفیع' مولانا احسان الٰہی ظہیر' مولانا محمد حسین شیخوپوری' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا یوسف اصلاحی' مولانا اجمل خان' مولانا اخلاق حسین قاسمی' مولانا عبدالکریم پاریکھ' عبدالمتین ہاشمی' سید نفیس شاہ رحمۃ اللہ علیہم۔اس کے علاوہ یہی شوق مجھے ربوہ لے گیا' جہاں اُس وقت کے قادیانی خلیفہ کی بات چیت سننے کا موقع ملا۔ غلام احمد پرویز کی بڑی شہرت تھی' چنانچہ مَیں نے ان کی رہائش گاہ 25-B گلبرگ جا کر ان کا درس سنا۔ان دونوں کی گفتگو

سحر انگیز تو تھی لیکن واضح قرآنی تعلیمات کے مطابق نہ تھی' لہٰذا مجھ پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

مَیں گاؤں میں تھا' جہاں دیہاتی اَن پڑھ مولوی جمعہ کا خطبہ دیتے' جس میں قرآن وحدیث کا ذکر شاذ ہی ہوتا۔ وہ سنی سنائی بے سند باتیں سناتے جس سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا۔ ہمارے گھر کے قریب کی مسجد میں مجھے جمعہ کے دن اردو تقریر کے لیے کہا گیا' چنانچہ میں نے ۱۱ جنوری ۱۹۶۳ء کو محلے کی مسجد میں جمعہ کا خطاب کیا اور پھر لگاتار کئی جمعے میرا ہی خطاب ہوتا رہا۔ چونکہ سامعین قصے کہانیوں کے رسیا تھے لہٰذا میری گفتگو ان کو مناسب نہ لگی' چنانچہ مجھے یہ مسجد چھوڑنا پڑی۔ پھر اپنے گاؤں کی ایک دوسری مسجد میں جمعہ کی تقریر کرتا رہا۔ وہاں بھی پذیرائی نہ ہوئی اور جہالت غالب آئی۔ اسی طرح گاؤں کی تیسری مسجد میں میں کئی سال جمعہ کا اردو خطبہ دیتا رہا مگر بالآخر وہاں بھی میری باتوں کو اجنبی جانا گیا' حالانکہ نہ میں کوئی معاوضہ طلب کرتا اور نہ مجھے تعریف کی خواہش تھی۔ ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ میں نے قریب کے ایک گاؤں میں خطبہ جمعہ دیا اور پھر کئی مہینے جمعہ کے لیے وہاں جاتا رہا۔

۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی کوارٹر میں مَیں جونیئر ٹیچر کے طور پر پڑھاتا تھا۔ میں نے مختلف اخبارات اور مذہبی رسالوں میں مضامین لکھنے شروع کیے جن میں سے اکثر اخلاقی موضوعات پر ہوتے۔ میری رہائش چوبرجی میں حالی سٹریٹ کے ایک دو کمروں کے کوارٹر میں تھی' جس کا ماہانہ کرایہ ۶۰ روپے تھا اور میری تنخواہ ۱۹۲ روپے ماہوار تھی۔

یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے' مَیں نے اخبار میں اشتہار دیکھا جس میں اطلاع تھی کہ سمن آباد میں ڈاکٹر اسرار احمد کا درسِ قرآن ہو گا۔ یہ ایک نیا نام تھا۔ مجھے تو علمائے کرام کے درس سننے کا شوق تھا' چنانچہ میں اپنی عادت کے عین مطابق وقت سے پہلے اس کوٹھی میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹر صاحب کا درس ہونا تھا۔ اشتہار میں دیے گئے وقت کے عین مطابق ڈاکٹر صاحب نے درس شروع کیا۔ مَیں انہماک کے ساتھ درس سنتا رہا۔ مَیں اس انتظار میں تھا کہ معلوم ہو کہ یہ کس مسلک کے عالم ہیں' مگر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں اور ان کی تفسیر قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ سے کی۔ اگرچہ درس ڈیڑھ دو گھنٹے کا تھا لیکن اس میں تلاوت کی گئی آیات کی تشریح کے علاوہ کوئی قصہ کہانی یا غیر متعلقہ باتیں نہ کہی گئیں۔ ایسی تقریر یا درس میں نے کبھی نہ سنا تھا۔ پھر تو مَیں ہر اتوار کو ڈاکٹر صاحب کے درس میں حاضر ہوتا۔ چونکہ میں بچپن ہی سے فرقہ بندی کے خلاف تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی کسی فرقے کے نمائندے نہ تھے' لہٰذا میری دلچسپی دن بدن بڑھتی گئی اور میں نے جان لیا کہ ڈاکٹر صاحب کو

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تفہیم کا ملکہ دیا ہے اور پھر گفتگو کا سلیقہ بھی۔ اس طرح سامعین ہمہ تن گوش اخیر تک ان کے درس میں حاضر رہتے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں جب مجھے SST کا status ملا تو مجھے لاہور سے باہر جانا پڑا۔ یہ نقل مکانی اگرچہ میری تنخواہ میں کافی اضافے کا باعث تھی مگر اس سے میں ڈاکٹر صاحب کے بصیرت افروز درس سے محروم ہو گیا۔ اب میری خواہش اور دعا تھی کہ مَیں کسی طرح لاہور واپس پہنچ جاؤں۔ میری آرزو ۱۹۸۹ء میں پوری ہوئی جب میرا تبادلہ ایم اے او کالج لاہور میں ہوا اور میں اپنی فیملی کے ساتھ لاہور میں ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص کرم فرمایا اور میری دعا کو شرفِ قبولیت بخشا کہ میں نے ایل ڈی اے کی طرف سے جوہر ٹاؤن میں الاٹ شدہ پلاٹ پر اپنا مکان تعمیر کر لیا' جو ابھی نامکمل ہی تھا کہ ہم نے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ میری یہ رہائش ڈاکٹر صاحب کے ادارے قرآن اکیڈمی سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اب تو ڈاکٹر صاحب کے درس سننے کا بھرپور موقع ملا اور ان سے بالمشافہ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں' بلکہ تین مرتبہ تو وہ میرے گھر بھی تشریف لائے۔ جس ہفتے ان کی رحلت ہوئی اس کے دوران بھی ان کا میرے گھر آنے کا پروگرام تھا' مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

میری شادی ۲۰ سال کی عمر میں ۱۹۶۰ء میں ہوگئی تھی۔ ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر کے پاس ایک کھلی جگہ تھی' وہاں سائبان کھڑا کیا گیا' اس کے نیچے دریاں تھیں۔ دریوں پر لمبے لمبے دسترخوان بچھا دیے گئے۔ دسترخوان کے دونوں طرف مہمان ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ برادری کے کارندوں نے ان کے سامنے سالن کے پیالے اور روٹیاں رکھ دیں۔ یا پھر دال چاول ہوتے تھے۔ سفید ابلے ہوئے چاولوں پر دیسی گھی اور چینی بھی ڈالی جاتی تھی۔ اضافی کھانا لینے کا بھی اہتمام تھا۔ یہ میری دعوتِ ولیمہ تھی۔ دعوت نامے بھیجنے کا رواج نہ تھا۔ کسی آدمی کے ہاتھ پیغام بھیج دیتے تھے۔ سادگی کا دور تھا۔ مہمان شادی والے گھر آتے تھے اور گھر سے ہی فارغ ہوتے تھے۔ شادی ہال وغیرہ کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ کئی برادریوں میں رواج تھا کہ مہمان کئی کئی دن ٹھہرتے تھے اور اہل خانہ ان کے لیے چارپائیاں اور بستر گلی محلّے سے عاریتاً لیتے تھے۔

۱۹۹۶ء میں بی بلاک جوہر ٹاؤن میں مسجد بن گئی اور مجھے اس کی انتظامی کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا اور ابھی تک یہ ذمہ داری میرے پاس ہی ہے۔ کئی سال تک جمعہ کا اردو خطبہ مَیں دیتا رہا۔ جب خطیب رکھ لیا تو پھر بھی کبھی کبھی مَیں اردو خطبہ دیتا رہا۔ ۱۹۹۸ء میں مَیں نے مسجد میں عشاء کی

نماز کے بعد ترجمہ قرآن شروع کر دیا۔ یہ پروگرام بھی آج تک جاری ہے۔

۱۹۹۹ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں اہلیہ کے ہمراہ مکّہ مکرمہ پہنچا۔ دو دن مکّہ میں رہے' پھر مدینہ کا سفر ہوا۔ مدینہ میں ۱۰ دن گزارے' مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرتے رہے اور مسجد کے حسن و جمال اور اعلیٰ انتظام سے خوب محظوظ ہوئے۔ ہم نے حرمین شریفین میں کوئی تصویر نہ بنائی۔ مدینہ سے دوبارہ مکہ آئے اور وہاں حج کے ارکان پورے کیے۔ طوافِ کعبہ میں وقت لگا یا۔ ہجوم کے باعث حجرِ اسود کا بوسہ نہ لیا جا سکا' البتہ طواف کثرت کے ساتھ کیے۔ پہلا موقع تھا' لہٰذا دل خوشی اور مسرت کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ بخشش کی دعائیں کرتے رہے۔ مکّہ کی مقدس جگہوں کی زیارت کی۔ غارِ حرا جانے کی کوشش نہ کی۔ مکّہ کے بازاروں کی رونق دل خوش کن تھی۔ عید وہاں پر ہوئی۔ طوافِ وداع کے بعد جدّہ پہنچے اور وہاں سے پاکستان واپس آ گئے۔

۲۰۰۱ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد گریجوایٹی کی رقم اور مختصر سی جائیداد اپنے بچوں میں تقسیم کر دی۔ بیٹے کو بیٹی سے دوگنی دی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کرے تو وہ تحفہ ہوتا ہے' وراثت نہیں۔ اس لیے ایسی صورت میں بیٹی کا حصّہ بھی بیٹے کے برابر ہوگا' چنانچہ میں نے بھی بیٹی کو مزید رقم دے کر بیٹے کے برابر کر دیا۔

۲۰۰۵ء میں میری اہلیہ فوت ہوگئی' اسے دفن کے لیے شیخوپورہ لے جایا گیا' جہاں حافظ عاکف سعید صاحب نے اُس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری اولاد بیٹے' بیٹی' پوتے پوتیاں' نواسہ نواسیاں سب نیک ہیں' جو نمازوں میں اور نمازوں کے علاوہ بھی اُس کے لیے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔

۲۰۰۶ء میں چند ماہ وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر ہیلے کالج پنجاب یونیورسٹی میں ڈیوٹی کی اور اسلامیات پڑھاتا رہا۔ اسی سال میرا بیٹا حافظ ظفر اپنے اہل وعیال کے ساتھ عمرے کو گیا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ بچوں نے حرمین شریفین کی زیارت سے بہت لطف اٹھایا۔ طواف کیا اور زیارتیں کیں۔

پوتی کی شادی کے سلسلہ میں ۲۰۱۳ء میں امریکہ جانا ہوا' وہاں ہوسٹن میں تین مہینے گزارے اور امریکیوں کا طرزِ معاشرت آنکھوں سے دیکھا اور وہ وہی ہے جو عام مشہور ہے۔ مسلمانوں کا وہاں مالی مفاد کے لیے رہنا چنداں دانش مندی نہیں۔ البتہ ان کی تعلیم کے ساتھ محبّت' وقت کی پابندی' دیانت داری کے ساتھ فرائض کی ادائیگی' قانون کا احترام قابلِ تعریف ہے۔ ہم اس سفر میں سات افراد تھے۔ میری بیٹی بھی اپنے شوہر اور بچوں سمیت ہوسٹن میں ہے'

اس لیے وہاں قیام اس کے ہاں رہا' جس کی شادی ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی۔

میرے پوتے اشعر بن داؤد نے قرآن حفظ کیا تو داؤد وعدے کے مطابق اسے عمرہ کے لیے لے گیا۔ ساتھ اُس کی اہلیہ اور بچے بھی تھے۔ مجھے بھی وہ ساتھ لے گئے۔ یہ عمرہ ۲۰۱۱ء میں ادا کیا۔ حرم شریف میں بیٹھ کر بچے سے قرآن سننے کا اور ہی مزہ ہے۔ دیکھنے اور سننے والے بھی محظوظ ہوتے اور کچھ پاس بیٹھ کر سنتے۔

دوسرا حج میں نے ۲۰۱۴ء میں کیا۔ میرا بیٹا حافظ ظفر اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کو گیا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ یہ حج پرائیویٹ کمپنی کے ذریعے تھا۔ اچھا انتظام تھا۔ تمام ارکانِ حج باسہولت اور آرام سے ادا کیے۔ مکّہ اور مدینہ دونوں جگہ رہائش کا اچھا انتظام تھا جو حرم کے بالکل قریب تھا۔

۲۰۱۷ء میں حافظ ظفر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عمرے کے لیے گیا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ وہاں سے واپس پاکستان آئے تو دوسرا بیٹا داؤد احمد عمرے کے لیے تیار تھا۔ اُس کے چھوٹے بیٹے عمر بن داؤد نے قرآن مجید حفظ کیا اور اس کے ساتھ بھی عمرے کا وعدہ تھا۔ چنانچہ داؤد کے اہل خانہ کے ساتھ میں نے بھی عمرہ کیا۔ عمر ابھی آٹھویں کا طالب علم تھا۔ وہاں حرم میں بیٹھ کر اس سے قرآن سنتے تو سننے والے پاس بیٹھ جاتے۔ بعض عربی تو خوش ہو کر اسے انعام دیتے۔ جب ہم لینے سے انکار کرتے تو وہ کہتے یہ ہدیہ ہے۔ ۲۰۱۷ء میں یہ میرا دوسرا عمرہ تھا جس کے لیے سعودی قاعدے کے مطابق اضافی رقم ادا کرنا پڑی۔

مَیں ڈاکٹر صاحبؒ کے بیٹوں کی دعوتِ ولیمہ میں بھی مدعو ہوتا رہا۔ حافظ عاکف سعید کے ولیمے کا دعوتی کارڈ تو اب تک میرے پاس موجود ہے۔ یہ وہی شادی ہے جو ۸ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ بمطابق ۶ نومبر ۱۹۸۱ء کو ہوئی اور کچھ لوگوں کو یہ عجیب بلکہ بُرا لگا کہ محرم میں شادی کر دی؟ حالانکہ شریعت مطہرہ میں کوئی دن ایسا نہیں جب شادی نہیں ہو سکتی۔ پھر حافظ عاطف وحید اور ۱۹۹۴ء میں آصف حمید کے ولیمہ میں شریک رہا۔ بعد ازاں میں ڈاکٹر صاحب کے پوتوں کے ولیمہ میں بھی شامل رہا۔

۲۰۰۱ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے قرآن اکیڈمی شعبہ مطبوعات میں تعینات کر دیا گیا' جہاں میں ماہنامہ میثاق کے لیے آرٹیکل لکھتا' جو عام طور پر اخلاقی موضوعات پر ہوتے۔ اس کے علاوہ تبصرے کے لیے آنے والی کتابوں پر تبصرہ لکھنا بھی میری ذمہ داری رہی۔ میرے جو مضامین میثاق میں شائع ہوئے اور ان کی تعداد کافی ہو گئی تو دوست احباب کے مشورے سے انہیں یکجا کر کے ''انوارِ ہدایت'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ انوارِ ہدایت کے دو حصے ہیں۔

دونوں حصّوں میں کُل ۱۱۳ مضامین ہیں۔ ان کی اشاعت کے بعد کے مضامین میثاق میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن اکیڈمی میں صبح ساڑھے دس بجے سٹاف کو چائے پیش کی جاتی ہے اور ہفتہ کے روز باقاعدہ چائے کا وقفہ ہوتا ہے جس میں سارا سٹاف ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتا ہے۔ میری ڈیوٹی لگ گئی کہ اس وقفے میں ہفتے کے دن مختصراً ایک حدیث بیان کر دیا کروں۔ چنانچہ مَیں یہ فرض اب تک نبھا رہا ہوں۔ جب یہ احادیث کافی ہو گئیں تو چالیس احادیث مع تشریح کتابی صورت میں ''حکمت نبویؐ'' کے عنوان سے شائع کر دی گئیں۔ تنظیم اسلامی کے ساتھ میری وابستگی اور قرآن اکیڈمی میں حاضری میرے لیے فخر اور اعزاز کا باعث ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا لگایا ہوا پودا ان کی وفات کے بعد بھی پھل پھول رہا ہے۔

ایک دفعہ ''یومِ اقبال'' پر ایوانِ اقبال میں اجلاس تھا' جس میں اکابرین سٹیج پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی سٹیج پر موجود تھے۔ قومی ترانہ پڑھا گیا تو سب لوگ حسبِ دستور کھڑے ہو گئے' مگر ڈاکٹر صاحب سٹیج پر بیٹھے رہے اور ترانے کے احترام میں کھڑے نہ ہوئے۔ سارا ہال ان کو دیکھتا رہا مگر انہیں حق کا اظہار کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ قیام اور قنوت نماز کے ارکان ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ یہ منظر بھی مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب عام طور پر مساجد میں جمعہ پڑھانے سے احتراز کرتے تھے' کیونکہ ہر مسجد کسی نہ کسی مسلک کی ہوتی ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب کسی مسلک کے اندر محصور نہ تھے۔ ہاں اگر معلوم ہو جاتا کہ مسجد میں سننے والے غیر فرقہ وارانہ باتیں سن لیں گے تو آپ کو جانے میں عذر نہ ہوتا۔ نومبر ۱۹۷۵ء میں میری خواہش پر آپ شیخوپورہ آئے اور وہاں جامع مسجد عیدگاہ میں جمعہ کا خطاب کیا۔ اجتماع معمول سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ نے شیخوپورہ کی بڑی جامع مسجد میں بھی خطاب کیا' یہ خطاب بھی میری خواہش پر کیا۔

کئی ہفتے آپ سمن آباد کی مسجد خضریٰ میں جمعہ کا خطاب کرتے رہے' جس میں علاقے کے عوام کا ہجوم دیدنی ہوتا۔ وہاں بھی جب مسلک آڑے آیا تو آپ نے یہ خطاب ختم کر دیا۔ کبھی کبھی مَیں بھی اس خطاب میں حاضر ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب بڑی عظیم الشان ''قرآن کانفرنسز'' کا اہتمام کرتے اور پاک و ہند کے بڑے بڑے علماء کرام کو ان میں خطاب کے لیے مدعو کرتے' کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا مشن ہی یہ تھا کہ لوگ قرآن کا پیغام سنیں اور اس پر عمل کر کے اسلام کی سربلندی اور ترویج میں حصّہ لیں۔

قرآن کانفرنسز کے علاوہ ڈاکٹر صاحب ''محاضراتِ قرآنی'' کا اہتمام کرتے‘ جس میں مختلف مسالک کے علماء کو مدعو کرتے۔ سامعین اکثر تنظیم اسلامی کے رفقاء ہوتے۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ علماء کی باتیں سنتے اور اس طرح ان پر حق واضح ہوتا کہ کون صحیح ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اجازت تھی کہ علماء اُن کے فکر کے خلاف بول سکتے ہیں‘ بلکہ جہاں ضرورت ہوتی وہاں وہ اعتراض بھی کر سکتے تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ فرقوں کے علماء کو نہ بلائیں‘ مگر ڈاکٹر صاحب عوام کو تقابلی باتیں سننے کا موقع فراہم کرتے۔

جولائی ۱۹۷۴ء میں قرآنی تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ ہفتہ بھر کا یہ پروگرام مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں تھا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر صاحب کے خطابات ہوئے۔ مَیں نے اس پورے پروگرام میں شرکت کی۔ یہیں ڈاکٹر صاحب نے ایک اجتماعیت تشکیل دینے کے عزم کا اعلان کیا جس کا مقصد اقامت دین ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع پہلے قرآن اکیڈمی اور پھر قرآن آڈیٹوریم میں ہوتا رہا‘ جس میں ملک بھر سے ارکان اور تنظیم کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک ہوتے۔ ۱۹۹۵ء میں تنظیم اسلامی کا بیسواں سالانہ اجتماع اقبال پارک (مینارِ پاکستان) کے مقام پر منعقد کیا گیا‘ جس کے ساتھ ''کُل پاکستان احیائے خلافت کانفرنس'' کا بھی انعقاد کیا گیا۔ بعدازاں کئی سال تک تنظیم کا سالانہ اجتماع فردوسی فارم‘ موضع دراجکے (نزد سادھوکے) میں ہوتا رہا۔ اب چند سال سے یہ اجتماع بہاولپور میں دریائے ستلج کے کنارے ہو رہا ہے۔ پروگرام تین دن کا ہوتا ہے‘ جس میں تنظیم کی قرآنی فکر سے متعلق مختلف عنوانات پر تقریریں ہوتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا مختصر ریفریشر کورس ہوتا ہے‘ مَیں بھی اس میں شریک ہوتا ہوں۔

تنظیم اسلامی ڈاکٹر صاحب کی قائم کردہ وہ اجتماعیت ہے جو اوّلاً اپنے ملک میں اور تدریجاً پوری دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ یہ وہی کام ہے جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر دی تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ اسلام پورے روئے ارضی کے ہر گھر میں داخل ہوگا۔ تنظیم اسلامی اسی جدّوجُہد میں لگی ہوئی ہے۔ کامیابی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۱۰/اپریل ۲۰۱۰ء کا دن تھا۔ نمازِ فجر کے بعد مجھے میرے چھوٹے بھائی نے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ مَیں ٹھٹھر کر رہ گیا اور اُسی وقت قرآن اکیڈمی پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی زیارت کی جو باوقار اور پُرسکون چہرے کے ساتھ ابدی نیند سو رہے تھے ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسّم بر لبِ اُوست

ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ باہر نکلا تو عاکف سعید صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے اس ہفتے میں آپ کے ہاں جانے کا پروگرام تھا۔ بعد نمازِ عصر ماڈل ٹاؤن سنٹرل پارک میں نماز جنازہ عاکف صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ پڑھنے والوں میں ملک کے دور دراز حصوں سے آئے ہجوم کو کنٹرول کرنا مشکل تھا۔ اذانِ مغرب سے ذرا پہلے قرآن اکیڈمی کے قریب آپ کو قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی حیاتِ مستعار ہی میں طویل مشاورتی عمل کے بعد اپنے بیٹے حافظ عاکف سعید صاحب کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر صاحب تنظیم کی امارت سے سبکدوش ہوئے تو مشاورت کے ساتھ یہ ذمہ داری حافظ عاکف سعید صاحب کو منتقل ہوگئی۔ عاکف صاحب نے تنظیم کو مستحکم کرنے اور اس میں نیا خون شامل کرنے کے لیے اپنی اہلیت اور استعداد کو پوری طرح بروئے کار لا کر اس کام کا حق ادا کیا اور قافلہ تنظیم عاکف سعید صاحب کی امارت میں اب تک رواں دواں رہا۔

کچھ عرصہ قبل حافظ عاکف سعید صاحب کی صحت خراب ہوئی اور ان کا حافظہ متاثر ہوا تو انہوں نے اپنی ذات کی خاطر دین اور تنظیم کا نقصان گوارا نہ کیا اور تحریری طور پر مرکزی عاملہ کو امارت سے اپنی دستبرداری سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ ۸/اگست ۲۰۲۰ء کو مرکزی شوریٰ کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا‘ جس میں محترم شجاع الدین شیخ کو نیا امیر تنظیم منتخب کر لیا گیا۔ حافظ عاکف سعید صاحب نے بھی نئے امیر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اللہ ربّ العزت نے شجاع الدّین شیخ صاحب کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کے دورِ امارت میں قافلہ تنظیم ان شاء اللہ العزیز آگے بڑھے گا‘ پھلے پھولے گا اور پاکستان میں دین متین کے نفاذ کے حوالے سے کئی سنگ ہائے میل طے کرے گا۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز !! ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Jan 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.1

Monthly Meesaq Lahore

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت وتعارف اور حقوق ومطالبات
جیسے علمی وعملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت واَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سورۃ الحمید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501(042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org